آئینہ نُما
BAB
مرتب
قرۃ العین

آئینہ نما

(۱۲)

مرتب

قرۃ العین

نام کتاب: آئینہ نما

مرتب : قرۃ العین

پتہ: باغات برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوئنٹ
ہسپتال برزلہ سرینگر

فون : 2433795 / 9419015745

کمپیوٹر کمپوزنگ: سید محمد شفیع

فون : 9797101561

سرورق: بشیر احمد بشیر

سال اشاعت: ۲۰۱۷ء

قیمت: عام ایڈیشن =/400

لائبریری ایڈیشن =/500

☆

فہرست

”ماسٹر پلان سے یوں شہریوں کو بہت نقصانات اُٹھانا پڑیں گے۔ لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ماسٹر پلان کے نام پر حکومت کو بہت سی زیادتیاں، ناانصافیاں اور من مانیاں کرنے کا موقع ملے گا۔ اب تک کسی نئے مکان یا بیت الخلاء کی تعمیر کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے میں صرف چار روپے یا پانچ سو روپے خرچ ہوتا تھا۔ اب ماسٹر پلان کے نام پر یہ رقم ایک ہزار سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ شہر کے ظاہری رنگ و روپ میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوگا لیکن رشوت ستانی اور بدعنوانی کے امکانات یقیناً بڑھ جائینگے“۔

اپنی بات

آئینہ نما نے اپنے سفر کی بارہویں (غالباً آخری بھی) منزل میں قدم رکھا ہے۔ اس شمارے کو ۲۰۱۶ء میں منظر عام پر لانے کا ارادہ تھا لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ حالات اتنے گھمبیر اور مخدوش تھے کہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ترتیب و تکمیل نہ ہو پائی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آئینہ نما کے گیارہویں شمارے کے بعد میرے پاس اتنا مواد نہیں تھا کہ میں بارہویں شمارے کے بارے میں سوچ سکتی۔ لیکن مجھے شمیم صاحب کے چند دوستوں نے اس بات کا بھرپور یقین دلایا تھا کہ ان کے پاس آئینہ کے جتنے بھی شمارے ہیں وہ مجھے 'ادھار' دیں گے۔ میں ان سب کی مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا اور میرے لئے بارہویں جلد کی اشاعت ممکن ہو پائی۔

یہ شمارہ شمیم صاحب کی مختلف تحریرات پر مشتمل ہے۔ اس میں کئی اہم سیاسی ادبی اور سماجی شخصیتوں کے خاکے، غیر معمولی اہمیت کے حامل دلچسپ خطوط اور طنز و مزاح کے کالم ہیں۔

اہم شخصیات میں مسٹر وید بھسین، میر غلام رسول نازکی، پروفیسر

رحمان راہی، عبدالغنی ترال، پشکر بھان، ستہ لال اور ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں۔

مجھے اس بات کا زندگی بھر افسوس رہے گا کہ وید جی کے حیات ہوتے ہوئے 'آئینہ نما' میں ان کا خاکہ شامل نہ کر پائی۔ دراصل میرا خیال تھا کہ شمیم صاحب نے (نامعلوم وجوہات کی بناء پر) وید جی کو آئینہ دکھانے سے گریز کیا تھا۔ خود وید جی نے میرے استفسار پر یہی کہا تھا (غالباً مجھے مرعوب کرنے کیلئے) کہ تم نہیں جانتی شمیم میرا بڑا لحاظ کرتے اور مان رکھتے تھے۔ میری شخصیت کو قلمی روپ دیکر اسے میری تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں سے پردہ اُٹھانا تھا اور یہ اسے کبھی گوارا نہ تھا۔ خود میں نے بھی ان کے جواب کی معقولیت پر یقین کیا تھا لیکن میں نے جب آئینہ کی حاصل کی گئی پرانی تحریروں میں وید بھسین کے علاوہ کئی اور اہم شخصیات کے خاکے دیکھے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

وید جی کی شخصیت کے بارے میں پڑھکر مجھے ایک تشنگی کا احساس ہوا اور میرا ماننا ہے کہ اس خاکے میں وہ ان کی ہمہ گیر، ہمہ جہت شخصیت کا مکمل احاطہ نہیں کر پائے ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی اہم اور روشن پہلوؤں پر ان کی گہری نظر نہیں گئی۔ غالباً اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ ان کی دوستی کا یہ ابتدائی دور تھا اور موت نے ان کو اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتے۔ بہر حال جتنا بھی لکھا ہے وہ ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اس میں ہفتہ وار اور روزنامہ آئینہ کے اہم اور تاریخی اداریے (جو اس دور کی سیاسی، سماجی، صحافتی اور ثقافتی زندگی کی بھرپور عکاسی

کرتے ہیں) کھلے خطوط اور طنز و مزاح کے کالم ہیں۔ آئینہ نما کا چھٹا شمارہ، کوہ کن کے قلم سے، مشغلے، مشورے، بے پر کی کے عنوانات پر مشتمل تھا۔ ان ہی کالموں کی ایک خاص تعداد (غیر مطبوعہ) اس شمارے میں بھی شامل ہے۔

شمیم صاحب ۱۹۷۴ء میں بیرونی دورے پر گئے تھے۔ دو مہینوں پر مشتمل اس سفر کو 'سفر نامہ' کے عنوان سے انہوں نے اپنے ہر لمحہ، گھنٹے اور دنوں کی مصروفیات کو قلمبند کیا ہے اور یوں یہ سفر نامہ ایک دلچسپ مربوط جامع اور تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے ہر لمحہ یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ اس سفر میں ان کے برابر شریک ہیں۔

ایک بات اور۔ اس شمارے میں بعض مضامین اس لحاظ سے ادھورے ہیں کہ ان کا آخری حصہ بہت کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا۔ جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ لیکن میں نے ان کو اس لئے شامل رکھا کہ ان تحریروں کی اہمیت، متن اور دلچسپی پر آخری حصہ کی عدم فراہمی کی تشنگی ان کے لب لباب اور مرکزی خیال پر غالب نہیں ہو سکی ہے۔ امید ہے آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔

آپ کی رائے کی منتظر
قرۃ العین

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا سوال ہندوستانی مسلمانوں کے لئے عزت و آبرو کا ہی نہیں، اپنی سیاسی قوت کی آزمائش اور اپنی زبوں حالی کے خلاف احتجاج کی علامت بھی بن گیا ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان کا مسلمان ذہنی اور فکری قیادت سے ہی نہیں، بلکہ سیاسی اور نظریاتی وابستگی سے بھی محروم ہو گیا۔ عدم تحفظ کے حساس نے اسے کبھی کانگریس کی گود میں ڈال دیا اور کبھی مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے اصطبل میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ کہیں کہیں مسلمانوں نے جن سنگھی قاتلوں سے بھی مفاہمت کی جسارت و حماقت کی۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے!

۱۹۶۵

وید بھسین

وید بھسین پر قلم اُٹھا کر میں نے اپنے آپ کو کڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ بہت ہی عزیز دوست ......اور مجھے اپنے دوستوں کی خوبیوں سے ہی نہیں ان کی خامیوں سے بھی پیار ہے۔ حیران ہوں کہ دوستی اور محبت کی چھاؤں میں بیٹھ کر حقیقت کے چہرے سے نقاب کیونکر اُٹھا دوں لیکن مجھے وید کی دوستی اور محبت پر اعتماد ہے وہ بارہا میری خطائیں معاف کر چکا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کی وسیع القلبی کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھاؤں۔

وید بھسین سے میری پہلی ملاقات ستمبر ۱۹۵۶ء میں انڈیا کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ تپ دق کی بیماری سے صحت یاب ہو کر سرینگر آیا تھا۔ پست قد، سیاہ فام اور اس باتونی نوجوان کی شخصیت میں مجھے ایک عجیب دلکشی نظر آئی۔ وہ ہر موضوع پر بات کر سکتا تھا اور بات کرتے وقت اس کے چہرے پر ایک نامعلوم سی شگفتگی آجاتی۔ اس کا چپ رہنا مجھے بالکل اچھا نہ لگتا بلکہ وہ جب خاموش ہو جاتا، تو بالکل احمق دکھائی دیتا۔ پھر ہم اکثر کافی ہاؤس

ہی میں ملتے رہے۔ اور غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔
اس قربت میں غالباً ہماری نظریاتی اور فکری ہم آہنگی کا زیادہ دخل تھا۔
وید بھسین کا خاندان تقسیم ملک سے پہلے جموں میں آباد ہو گیا تھا اور وہ
اپنے آپ کو سو فیصدی جموی تصور کرتے ہیں۔ اُن کی تعلیم جموں میں ہی مکمل
ہوئی ہے۔ اور ان کی سیاسی زندگی کا آغاز بھی ان کے طالب علمی کے ساتھ
ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے کالج کے بڑے جوشیلے مقرر تھے۔ اُن دنوں ہندی میں
نظمیں اور کہانیاں بھی لکھتے تھے۔ ان کی طالب علمانہ سیاست کے متعلق
میری معلومات بہت وسیع نہیں ہیں۔ لیکن ایک بات وثوق کے ساتھ کہی
جا سکتی ہے کہ ایام طفولت سے لیکر ایام جوانی تک انہوں نے کبھی فرقہ پرست
سیاست کا ساتھ نہیں دیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کے دیگر حصوں کی
طرح جموں میں بھی فرقہ پرستی کا زہر پھیل گیا تو وید بھسین نامساعد حالات
اور ناسازگار ماحول میں بھی فرقہ پرستوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔
مسلمانوں کی حفاظت اور ان کو ضروریات زندگی بہم پہنچانے کے سلسلے میں
وید بھسین نے قابل تعریف کام کیا ہے۔ جموں میں امن و امان قائم ہونے
کے بعد وہ عملی سیاست کے بھنور میں کود گئے۔ لیکن نیشنل کانفرنسی قیادت سے
ان کی نہ نبھ سکی۔ اس کے بعد انہوں نے غلام رسول عرفانی کے ساتھ مل کر نیا
سماج نکالا۔ نیا سماج پر حکومت کا عتاب نازل ہوا۔ اس دوران میں وید
بھسین پر بلراج پوری اور اوم پرکاش صراف کا اثر غالب ہو گیا۔ اور وہ پرجا
سوشلسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے۔ اشوک مہتہ ان کے ہیرو ہو گئے۔ اور پر

جا سوشلسٹ پارٹی کے پروگرام میں انہیں ملک کی نجات نظر آنے لگی۔ ۱۹۵۳ء کے بعد جب اشوک مہتہ سرینگر تشریف لائے اور نیشنل کانفرنسی غنڈوں نے لالچوک میں ان پر حملہ کردیا تو وید بھسین ان کے ساتھ تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے موجودہ وزیر داخلہ (جوان دنوں نائب وزیر داخلہ تھے) کو ٹیلی فون پر اس واقع کی اطلاع دی تو انہوں نے جواباً کہا کہ آج چھٹی کا دن ہے اور قانون کو بھی آج چھٹی دی گئی ہے۔ بہر کیف، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ کہنا یہ تھا کہ وید بھسین پر جا سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رکن ہوگئے۔ ۱۹۵۴ء میں ان پر تپ دق کا حملہ ہوا۔ اور وہ سینی ٹوریم میں داخل ہوگئے بیماری کے دوران بخشی غلام محمد وید بھسین کی مزاج پرسی کرتے رہے (بخشی صاحب کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے بھسین صاحب کے لئے غیر ممالک سے قیمتی ادویات بھی منگائیں) اور جب وہ صحت یاب ہوکر نکلے تو ان کے ذہن پر بخشی صاحب کی عظمت اور ان کی بلند اخلاقی کا گہرا نقش مرتب ہوگیا تھا وہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کی رُکنیت سے الگ تو نہیں ہوئے لیکن عملی طور پر نیشنل کانفرنس کے رکن بن گئے۔ بخشی صاحب کی مسکراہٹوں کی بارش اور ان کے اعتماد کی چھاؤں میں بیٹھ کر وید بھسین کو کچھ دیر کے لئے سکون مل گیا۔ لیکن یہ سکون عارضی تھا۔ ان کا ذہن کبھی کبھی ان کی شخصیت کا خول توڑ کر باہر کی طرف جھانکتا۔ پڑھا لکھا نوجوان کب تک اپنے شعور کو اپنے قابو میں رکھ سکتا ہے۔ بخشی صاحب نے اس اضطرار کی کیفیت کو محسوس کیا تو انہیں اپنے ذاتی اخبار "کشمیر پوسٹ" کی ادارت سونپ دی۔

پرجا سوشلسٹ پارٹی کے رکن ہونے کی وجہ سے وید کمیونسٹوں کے خلاف تھا۔ بخشی صاحب نے اس انٹی کمیونسٹ جذبے کو اپنے مفادات کیلئے استعمال کیا اور وید بھسین نے اپنی تمام تر صلاحیتیں بخشی صاحب کا بت تراشنے میں صرف کردیں۔ لیکن میں یہ بات ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وید اپنے اس رول سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ بھری محفلوں میں اپنی بے اطمینانی اور بے چینی کا اظہار کرتے رہے کئی بار ''کشمیر پوسٹ'' میں ایڈمنسٹریشن کے خلاف ایسی خبریں چھپتی رہیں جنہیں بخشی صاحب نے قابل اعتراض قرار دیا۔ انہی دنوں وید بھسین اور آئینہ ساز نے ''نیا سماج'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ ''نیا سماج'' کے چار ہی شمارے چھپ گئے تو حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا۔ وید بھسین پر زبردست دباؤ ڈال کر ''نیا سماج'' بند کر دیا گیا۔ اور وید بھسین نے ایکبار پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ لیکن یہ سمجھوتہ بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اب انہیں بخشی صاحب کا مکمل اعتماد حاصل نہ تھا۔ اگست میں پُراسرار حالات میں ''کشمیر پوسٹ'' میں بخشی غلام محمد کا ایک ایرانی اخبار نویس کو دیا ہوا وہ بیان چھپ گیا جو نہیں چھپنا چاہیئے تھا۔ پھر ایک دن بخشی صاحب کے ایک چہیتے افسر کے خلاف ایک خبر شائع ہوگئی۔ یہ بات بخشی صاحب کو بہت ناگوار گذری اور اس طرح وید بھسین کی آزادی کا سامان مہیا ہوگیا۔ انہیں ''کشمیر پوسٹ'' سے مستعفی ہونا پڑا۔ اور انہوں نے سندیش کی ادارت سنبھالی۔ بخشی صاحب نے سید نذیر حسین سمنانی، مالک سندیش پر دباؤ ڈال دیا کہ اُسے سندیش سے الگ کر دیا جائے۔ سمنانی صاحب بڑی

الجھن میں تھے کیا کریں۔ وید نے خود ہی مستعفی ہو کر ان کی مشکل آسان کردی۔

اس کے بعد وید نے ''کشمیر ٹائمز'' جاری کردیا اور اب وہ آئینہ سے بھی منسلک ہے۔ شیخ صاحب کی رہائی پر جموں میں ان کا استقبال منظّم کرنے میں بڑی تندہی سے کام کیا۔ لیکن آج کل وہ شیخ صاحب سے مایوس دکھائی دیتا ہے۔ وید بڑا جذباتی آدمی ہے۔ اس کی محبت کی طرح اس کی نفرت کا بھی کوئی جواز نہیں۔ اس نے ابھی تک اپنی زندگی کی کوئی منزل متعین نہیں کی ہے۔ وہ اپنی سیاست میں نظریات سے زیادہ جذبات سے کام لیتا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس نے مطالعہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب اس کی معلومات صرف اخبارات اور رسائل تک محدود ہیں۔ وہ اتنا لاپرواہ آدمی ہے کہ کسی کام کے لئے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو آدمی کسی کو پیسہ دے کر پھر بھول جائے وہ آدمی ضرور کسی کے پیسے بھی دبا سکتا ہے اور وید اکثر اپنے دوستوں کو قرض دے کر بھول جاتا ہے۔ وید بھسین فرقہ پرست نہیں لیکن صوبہ پرست ضرور ہے۔ وہ ہر مسئلے میں جموں کے نکتہ نظر سے بحث کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ اتنا ذہین اور باشعور آدمی صوبائی تعصب میں کیونکر گرفتار ہوگیا ہے۔ ابھی حال ہی میں وہ نیشنل کانفرنس کے شعبہ نشر و اشاعت کا رکن نامزد کیا گیا ہے۔ اور آجکل میر قاسم کا پرستار ہے۔

۱۹۷۵

ڈی پی در

دُرگا پرشاد دَر کی موت نے کچھ دیر کے لئے صرف کچھ دیر کے لئے۔
زندگی کی بے ثباتی کا احساس گہرا کر دیا ہے، ان کے کھلتے ہوئے چہرے،
ان کی دلنواز مسکراہٹ، مردانہ وجاہت اور رنگین شخصیات کے ساتھ موت کیا،
موت کا تصور بھی وابستہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن جس غیر متوقع طور پر، ان کی
زندگی نے، موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے ہم سب کو ہی نہیں
فرشتۂ اجل کو بھی حیرت میں ڈال دیا ہوگا۔ ڈی پی اتنی آسانی سے ہار ماننے
والے نہیں، ضرور ان کی موت میں بھی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی!

ڈی پی زندہ تھے، تو ان کی شخصیت اور سیاست سے وابستہ وہ
تضادات اور فسادات ان کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں دیتے
تھے کہ جن سے ان کی ساری زندگی عبارت تھی، وہ مر گئے ہیں، تو رہ رہ کر ان
کی ذہانت اور فطانت، متانت اور ظرافت کے وہ معجزے یاد آ رہے ہیں کہ
جنھوں نے ڈی پی کو اپنی زندگی میں ہی ایک افسانہ (Legend) بنا دیا تھا۔
ان کی شخصیت کی دلنوازی اور دل آویزی نے ان کی بہت سی کمزوریوں اور
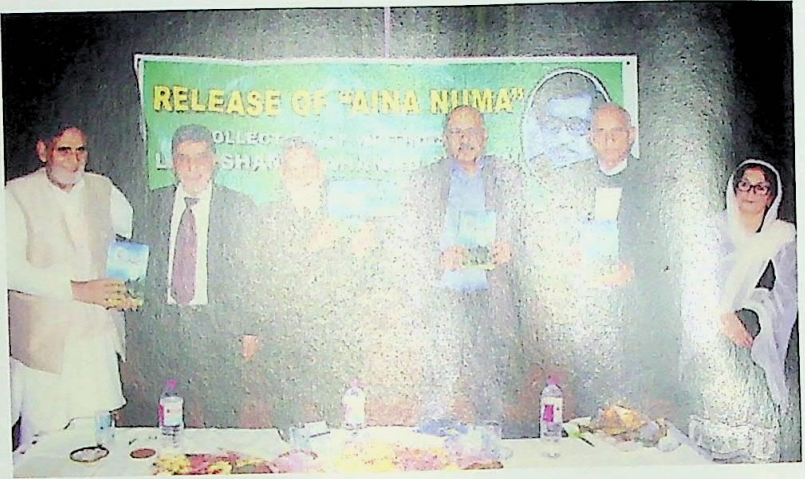
گیارہویں شمارے کی چند جھلکیاں

کوتاہیوں کو بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاست اور ان کے عمل اور طرزِ عمل دونوں سے اختلاف کرنے والے بھی ان کی ذاتی خوبیوں کے معترف تھے۔ ان کا اسٹائل نا قابلِ تقلید تھا اور وہ اپنے کردار سے زیادہ اپنے اسٹائل سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، ان کی موت ایک فرد کی ہی نہیں، ایک کلچر، ایک اسٹائل اور ایک خاص لہجے کی موت ہے، وہ ایک سیاسی فنکار تھے ایک صاحب طرز اور صاحبِ اسلوب فن کار، کہ جس نے سیاست کو بھی اپنی شخصیت کی رنگینی اور رعنائی عطا کی تھی، صرف ۵۷ سال کی عمر میں ڈی پی جیسے بھرپور آدمی کی موت زندگی کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے، اور اس پر جتنا ماتم کیا جائے، کم ہے!

اس اخبار کے قارئین اور میری سیاسی زندگی سے واقفیت رکھنے والے سبھی لوگ جانتے ہیں کہ میں نے پچھلے دس سال کے دوران ڈی پی پر اپنی زبان اور قلم کے کتنے تیر برسائے ہیں۔ ''آئینہ'' کے صفحات گواہ ہیں کہ میں نے بارہا ڈی پی کو اس کے کردہ اور نا کردہ گناہوں کے لئے بڑی بے رحمی کے ساتھ طنز و تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ریاستی اسمبلی میں میری اور ان کی معرکہ آرائیاں، بعض اوقات بے حد تلخ اور نا گوار صورت اختیار کر جاتی تھیں اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے کئی بار ان کے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں لیکن ڈی پی کی حاضر جوابی ان کی شگفتہ مزاجی اور ان کی تقریر کی برجستگی کے سامنے مجھے کئی بار ہار ماننا پڑی۔ میں دل ہی دل میں اس کی

قابلیت ذہانت اور برتری کا قائل تھا لیکن میری زبان اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتی تھی، دل وزبان کی یہ کشمکش بہت دنوں تک ڈی پی اور میرے درمیان حائل رہی۔ بالآخر اس کی سحر انگیز شخصیات نے مجھے مغلوب کر دیا اور مجھے اس کی بہت سی خامیوں میں کچھ ایسی خوبیاں بھی نظر آئیں کہ جوان کے کسی دوسرے ساتھی یا ہم عصر سیاستدان میں موجود نہیں۔ پچھلے دو تین سال سے مجھے ڈی پی کو کچھ زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے انہیں بالکل بدلا ہوا پایا۔ وقت نے انہیں بدل دیا تھا، یا خود میری نگاہ بدل گئی تھی۔ میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ان کی شخصیت میں اب کچھ متانت، سنجیدگی اور ٹھہراؤ سا آ گیا تھا، ان کی نظر زیادہ وسیع اور ان کی فکر پہلے سے زیادہ پختہ ہوگئی تھی، وہ اب اپنی ذات سے بُلند ہو کر سوچنے لگے تھے، اور میں اِس بات کی شہادت دینا چاہتا ہوں کہ شیخ محمد عبداللہ اور مرکزی حکومت کے درمیان حالیہ سمجھوتے کو ممکن بنانے میں اگر سید میر قاسم کے بعد کسی دوسرے شخص نے غیر معمولی رول ادا کیا ہے، تو وہ ڈی پی در تھے۔ مذاکرات کے درمیان کئی ایسے نازک مرحلے بھی آئے کہ اگر ڈی پی عزم صمیم اور خلوصِ نیت کے ساتھ معاملات سلجھانے کی کوشش نہ کرتے، تو شیخ صاحب کے ساتھ مفاہمت کی بات چیت اتنی جلدی، اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچ پاتی ...... ان کی زبردست خواہش تھی کہ شیخ صاحب کی زندگی میں ہی، ان کے ساتھ کی گئی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا کفارہ ادا ہونا

چاہیے۔ اور اسی لئے وہ اس سمجھوتے کی کامیابی کے لئے کوشاں تھے، انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ دراصل اپنی زندگی کی آخری خواہش پوری کر رہے تھے!

ڈی پی کی خوبیوں اور اس کے خلق نے جہاں بہت سے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہاں اس کی پے درپے کامیابیوں نے اس کے بہت سے دشمن بھی بنا دیئے تھے اور میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے، کہ ان کے دوست زیادہ تھے یا دشمن، وہ جب تک اس ریاست کی سیاست یا حکومت سے وابستہ رہے ہر سازش اور لغزش کے لئے انہیں ہی ذمہ دار گردانا جاتا رہا۔ حد یہ ہے کہ جب وہ یہاں سے ہزاروں میل دور ماسکو میں مقیم تھے، تو ان کے دشمنوں (جن میں یہ خاکسار بھی شامل تھا) کو ان پر یہ الزام لگانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا کہ وہ ماسکو میں بیٹھ کر یہاں کی سیاست میں مداخلت کرتے تھے۔ دراصل ان کی ذہانت اور زیرکی کا اتنا شہرہ تھا کہ ان کے دشمن اُس کے سائے سے بھی ڈرتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاست کے داؤ پیچ میں وہ اتنے ماہر تھے، کہ ان سے دشمنی کر کے کوئی شخص اپنے آپ کو بالکل محفوظ متصوّر نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سے لوگ ان سے صرف اس لئے خائف رہتے تھے کہ وہ ذہنی، فکری اور علمی سطح پر ڈی پی کا مقابلہ نہیں کر پاتے تھے اور کچھ لوگ صرف رشک اور رقابت کی آگ میں جل کر ڈی پی کی مخالفت اپنا فرض اور ایمان سمجھتے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑی متنازعہ شخصیت کے مالک تھے اور ان کی شخصیت ہی کی طرح، ان کی

سیاست اور ان کا رول بھی متنازعہ تھا اور اگر انکی سیاست ان کے نظریات اور ان کے طریق کار کے متعلق غیر جانبداری کے ساتھ کچھ کہنے کی نوبت آئے تو ان کے بہترین دوستوں کیلئے بھی ڈی پی کی ہر بات کی مدافعت ناممکن ہوگی۔ لیکن سیاست کی بے رحم اور بے اصول دنیا میں کون ہے جو ڈی پی جیسے گنہگار پر پہلا پتھر مار سکتا ہے۔

درگا پرشاد در کو کبھی اپنی زندگی میں عوامی مقبولیت حاصل نہیں رہی، اور میرے خیال میں انہوں نے کبھی اس کی تمنا بھی نہیں کی، لیکن اس کے باوجود وہ کشمیر اور ملک کی سیاسی زندگی پر آخری عمر تک چھائے رہے اور ریاست اور مرکز میں بڑے اہم اور کلیدی عہدوں پر متمکن رہے، انکا یہ عروج محض ان کی ذہانت، قابلیت اور اہلیت کا انعام تھا اور انہیں جو بھی ذمہ واری سونپی گئی۔ انہوں نے اسے بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ ان کی سیاست سے قدم قدم پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن ان کے ذہن اور دہن کی خوبیوں کے متعلق دو رائیں ممکن نہیں۔ اِن کی زبان میں ایسا جادو اور ان کی شخصیت میں ایسا سحر تھا کہ وہ صرف چند لمحوں میں اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی اپنا گرویدہ بنا سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب انہیں سیاست سے اُٹھا کر سفارت کے صحراؤں میں بھیج دیا گیا۔ تو انہوں نے وہاں بھی اپنی شیریں کلامی اور خوش گفتاری سے خوبصورت پھول اُگائے، وہ جادوگر تھا۔ اور اِس نے اپنے جادو سے بیک وقت بہت سے معصوموں اور گنہگاروں کو اپنا مطیع بنا

دیا تھا، افسوس کہ موت نے اپنی مداخلت بے جا سے اس طلسم کو توڑ دیا۔ ڈی پی کشمیر کے سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ رنگین، متمدن، مہذب اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انہیں اُردو شعر وادب سے ہی نہیں، فارسی زبان سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اور ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ انگریزی زیادہ اچھی بولتے تھے یا اُردو، میں نے ریاستی اسمبلی میں انہیں بڑی صاف، شستہ اور بامحاورہ اُردو بولتے سنا ہے اور پارلیمنٹ میں تو ان کی انگریزی کی دھوم تھی۔ بہت سے لوگ صرف ان کی انگریزی سننے کیلئے پارلیمنٹ آتے، ان کے پاس کتابوں کا اتنا بیش قیمت اور وافر ذخیرہ ہے کہ اس ریاست میں ہی نہیں، شاید پورے ملک میں کسی کے پاس نہ ہو پچھلے سال لندن میں میری ان سے ملاقات ہوئی تو ان کا سارا کمرہ کتابوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور وہ انہیں اپنے ہمراہ لانے کے لئے ان کی پیکنگ کروا رہے تھے، وہ پاکستان گئے تو وہاں سے بھی پاکستانی ادیبوں کی تازہ ترین تخلیقات کے مجموعے ساتھ لائے، وہ اقبالؔ کے بڑے عاشق اور غالبؔ و میرؔ کے بہت مداح تھے اور یہ ان ہی کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ حکومت ہند نے اقبالؔ کی صد سالہ برسی کو سرکاری طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے۔

ڈی پی کو اپنے کشمیری ہونے پر ناز تھا۔ اور وہ جہاں بھی گئے، اُنہوں نے کشمیر کے نام کو چار چاند لگا دیئے۔ معاہدہ شملہ پر پارلیمنٹ میں بحث کے دوران، میری تقریر کی تعریف کرتے ہوئے ڈی پی نے ان الفاظ میں میری

تعریف کی ''کل آپ کی معرکتہ الآراتقریر سن کر مجھے بہت دنوں بعد ایکبار پھراپنے کشمیری ہونے پر فخر کا احساس ہوا''...... کشمیر کے اکثر سیاسی رہنما، غیروں کے سامنے، احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔لیکن ڈی پی کو اپنے اوپر بے پناہ اعتماد تھا۔ اور وہ دنیا کے کسی فورم میں بھی، کسی کے سامنے احساس کمتری کا شکارنہیں ہوتے تھےان کے بدترین مخالف اور دشمن بھی ان کے وجود پر فخر کرسکتے تھے۔اوراس اعتبار سے ان کی موت کشمیر کیلئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

ڈی پی کی زندگی کا سب سے بڑاالمیہ یہ ہے کہ جب انہیں ماسکو سے بلاکر مرکزی وزارت میں شامل کرلیا گیا۔توانہیں ایک ایسے محکمے کی ذمہ داری سونپ دی گئی کہ جس کے متعلق وہ بہت کم جانتے تھے۔انہوں نے کئی بار میرے سامنے یہ اعتراف کیا کہ ''پلاننگ'' میرا مضمون نہیں ہے اور مجھ پر یہ زبردستی لاد دیا گیا ہے،لیکن مسز گاندھی کے سامنے ''نہیں'' کہنے کی کیسے جرأت ہوسکتی تھی۔ اِس لئے چارونارانہیں یہ بوجھ اُٹھاناہی پڑا۔اور جب ناگزیر حالات کی بنا پر افراط زراور مہنگائی کی سطح اونچی ہوتی گئی،تو ڈی پی کو قربانی کا بکرابنا کر مرکزی وزارت سے الگ کردیا گیا۔مجھے اس بات کا ذاتی علم ہے کہ وہ ماسکو جانے کے لئے ہرگز ہرگز تیانہ تھے۔انہوں نے مسز گاندھی سے صاف طور کہہ دیا تھا کہ ماسکو کی آب وہواان کی صحت کے لئے ناسازگار ہےلیکن اس باربھی وہ مسز گاندھی کے اصرار کے سامنے انکار نہ

کر سکے۔ اور انہیں بادلِ ناخواستہ ماسکو جانا ہی پڑا۔ وہ ماسکو گئے ضرور لیکن ان کا دل وہاں نہیں لگا۔ اور پھر میرؔ کے الفاظ میں ؎

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ڈی پی مر گئے۔ لیکن ان کی یاد بہت دنوں تک آئیگی ان کی مخالفت میں بھی ایک ذہنی انبساط کا احساس ہوتا تھا اور اب ان کی تعریف سے بھی ایک طرح کی جذباتی تسکین محسوس ہو رہی ہے۔ اسے اچھے اور بُرے، نیک اور بد کے معیاروں پر نہیں جانچا سکتا۔ وہ ایک بھرپور آدمی تھا۔ اور اس میں انسانوں کی ساری خوبیاں اور خامیاں موجود تھیں۔ یہ مصرع غالباً اس کے لئے کہا گیا ہے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۱۹۶۶

احرار صاحب

احرار صاحب نہ سیاسی لیڈر ہیں اور نہ سرکاری افسر، ان کا شمار معزز شہریوں میں ہوتا ہے اور نہ شاعروں اور ادیبوں میں، لیکن اس کے باوجود آئینہ ساز نے آج تعارف کیلئے ان کی شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ سیاسی بازی گروں، سرکاری شاعروں اور قصیدہ گو شاعروں کو ہماری زندگی میں اتنی اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ ہم اکثر اپنے اردگرد بکھری ہوئی کہانیوں کے چھوٹے چھوٹے مگر اہم کرداروں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ احرار صاحب ہماری سیاسی تاریخ کے ایک ایسے کردار ہیں جو شہرت اور ناموری کے رتبے تک تو نہ پہنچ سکے لیکن جنہوں نے دوسروں کے سروں پر شہرتوں کا تاج رکھنے کے لئے اپنی ننگی پیٹھ پر کوڑے کھائے۔

نواب بازار کی سڑکوں پر سیاہ چشمہ لگائے ہوئے لاٹھی سے سڑک کے نشیب و فراز محسوس کرتا ہوا ایک اندھا شام کو چہل قدمی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا نام عبدالغفار ہے۔ لیکن سارا محلّہ اسے احرار صاحب کہتا ہے۔ احرار صاحب آج سے تیس سال پہلے اوری صاحب کی سرکردگی میں جامع مسجد

سرینگر کی مرمت کے دوران اپنی آنکھوں کی روشنی کھو بیٹھے۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ماں باپ کے پاس کھوئی ہوئی روشنی واپس لانے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ اس لئے احرار صاحب کے لئے زندہ رہنے کی خاطر بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن احرار ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے باعزت طور پر زندہ رہنے کا عزم کیا۔ احرار صاحب نے اپنے لئے ایک ایسا پیشہ اختیار کیا جس میں آنکھوں کی روشنی کی بجائے جسمانی قوت کی ضرورت تھی۔ انہوں نے چادریں اور کمبل مالیدہ کرنے اور نمدے دھونے کا کام شروع کیا پچھلے تیس برسوں سے احرار صاحب محنت مزدوری کر کے نہ صرف اپنا پیٹ پال رہے ہیں بلکہ اپنے عزیز و اقارب کیلئے بھی ایک سہارا بنے ہوئے ہیں۔

سیاست سے احرار صاحب کی دلچسپی ان کے بچپن کی یادگار ہے۔ انہوں نے اگرچہ کبھی کسی مدرسے میں ابتدائی تعلیم بھی حاصل نہیں کی ہے لیکن ان کی سیاسی معلومات ہمارے ہاں کے بہت سے سیاسی لیڈروں سے بھی زیادہ ہیں وہ چونکہ عنفوان شباب میں ہی میر واعظ خاندان کے حلقہ اثر میں آچکے تھے اس لئے ان کی سیاسی زندگی ایک مخصوص ڈگر پر قائم رہی۔ وہ پہلے مسلم کانفرنسی تھے، پھر مسلم لیگی ہوگئے۔ اور آج کل مولوی محمد فاروق کے عقیدت مند ہیں۔ لیکن فرقہ پرست سیاست سے ان کا لگاؤ اور وابستگی ان کی تنگ نظری یا اندھی تقلید کی پیداوار نہیں۔ وہ اپنے نظریات کی صحت پر مکمل

یقین رکھتے ہیں ۔ انہیں ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ سے پوری واقفیت ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ پاکستان قائم کرنے کی تمام تر ذمہ داری فرقہ پرست ہندوؤں پر ہے۔ احرار صاحب کو مذہبی علوم اور موجودہ سیاسی مسائل سے گہرا شغف ہے۔ وہ صرف مسئلہ کشمیر سے ہی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ویٹنام ، برلن اور مشرقی وسطیٰ کے موضوعات سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ ہر روز باقاعدگی سے اپنے دوست احباب سے اخبار پڑھواتے ہیں، اور ہر مسئلے کے متعلق اپنی ایک رائے رکھتے ہیں۔

احرار صاحب کے پاس زمانے نے کچھ نہ رہنے دیا۔ اب صرف ، ماضی کی یادیں رہ گئیں ہیں۔ ان کے سبھی جاننے پہچاننے والے پاکستان چلے گئے یا راہی عدم روانہ ہو گئے۔ میر واعظ مولوی یوسف شاہ صاحب ، چودھری غلام عباس ، مولوی عبدالرحیم ، اللہ رکھا ساغر ، چودھری حمید اللہ ، مولوی محمد عبداللہ وکیل یہ سب احرار صاحب کے دوستوں میں تھے۔ مولوی محمد عبداللہ وکیل سے ان کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ بعض لوگ آج بھی انہیں میرزائی کہہ کر پکارتے ہیں۔ مسلم کانفرنسی لیڈر احرار صاحب کے ذوق وشوق اور جوش وخروش کی بڑی قدر کرتے تھے۔ نواب بازار میں ان کے مکان پر اکثر یارانِ طریقت کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔

احرار صاحب کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ مرحوم محمد علی جناح سے ان کی ملاقات ہے ۱۹۴۷ء میں جب محمد علی جناح کشمیر تشریف لائے تو احرار

صاحب ان کی خدمت میں شہد لیکر حاضر ہو گئے۔ آج اکیس سال بعد بھی جب احرار صاحب جناح صاحب سے اپنی اس ملاقات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے چہرے پر ایک غیر معمولی رونق آجاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے سب دُکھ درد مٹ گئے ہوں۔ انہوں نے اس ملاقات کا واقعہ آج تک سینکڑوں بار دہرایا ہوگا لیکن ہر بار اسی جوش وخروش سے سناتے ہیں کہ جیسے پہلی مرتبہ سنا رہے ہوں۔ اس بڑھاپے میں ان کی زندگی کا سہارا ایسے ہی دو ایک واقعات ہیں۔ احرار صاحب شیر بکرا لڑائی میں کئی مرتبہ پٹ چکے ہیں۔ لیکن آزادی کے بعد شیخ غلام قادر گاندربلی کے ہاتھوں انہوں نے جو زخم کھائے وہ ابھی تک مندمل نہیں ہوئے ہیں۔ احرار صاحب انہیں ''آزادی کا تحفہ'' کہہ کر ایک زاوردار قہقہہ بلند کرتے ہیں۔

احرار صاحب کا تعلق کبھی بھی خاکسار جماعت سے نہیں رہا ہے۔ لیکن ان کے جوش وخروش اور خلوص سے متاثر ہو کر احباب نے انہیں احرار کا لقب دیا تھا اور اب وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے خود تو شادی نہیں کی ہے لیکن بہو بیٹیوں کی شادی بیاہ کے انتظامات کے لئے اکثر لوگ ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

احرار صاحب خود مالی طور پر کبھی آسودہ نہیں تھے۔ لیکن ان کی ایمانداری اور دیانتداری کی وجہ سے اکثر دولت مند انہیں اپنا ''امین'' مقرر کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا

اور کبھی کسی کی امانت میں خیانت کے گنہگار نہیں ہوئے احرار صاحب کو
آنکھوں کی روشنی نہ مل سکی لیکن ضمیر، ذہن اور دل کی روشنی میسر ہے اسی لئے
وہ زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوئے ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک دلآویز
مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے انہیں دیکھ کر زندگی پر پیار آنے لگتا ہے۔ احرار
صاحب بلا کا حافظہ رکھتے ہیں ایک بار آپ سے متعارف ہو جائیں پھر آپ
دس برس بعد بھی مِل جائیں تو آپ کی آواز پہنچان لینگے۔ وہ نواب بازار
سے امیرا کدل تک کا سفر تن تنہا کرتے ہیں۔ آئینہ ساز پچھلے دس برسوں سے
احرار صاحب کو جانتا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اپنی Idiosyncries کے
باوجود احرار صاحب شہر کی سب سے دلچسپ اور متنوع شخصیت ہیں۔

میر غلام رسول نازکی

آخر اس سال وہ مبارک ساعت آہی گئی۔ جب نازکی خدا خدا کر کے ریٹائر ہو گئے نازکی نے ریٹائر ہونے کے بعد اطمینان کا سانس لیا ہوگا یا نہیں۔ یہ تو اللہ کے بعد علامہ اقبالؒ کی رُوح ہی بتا سکے گی۔ لیکن ہم نے نازکی کے ریٹائر ہونے کے فوراً بعد اُن کی سابق نوکری سے ایک انٹرویو لیا۔ نوکری بڑی خوش وخرم اور شادان و حرمان نظر آئی۔ ہم نے اس شاندار اور بے نظیر موڑ کا کارن پوچھا تو اپنے آپ اپنی بلائیں لیتی ہوئی بولی۔ شکر ہے اللہ کا! یہ پیر تسمہ پا میرے کاندھوں پر سے اُتر گیا۔ اب میں اس کے عذاب سے آزاد ہوں۔'' جی ہاں۔ یہ بات یقینی ہے کہ بی ملازمت نے نازکی کے پنشن یافتہ بننے پر اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اور اب وہ پروفیسر جے ایل کول کو ان کی Chronic ملازمت سے نجات دلانے کے لئے سر توڑ کوششوں میں لگ گئی ہے۔

باندی پورہ کے نزدیک ایک گاؤں ہے ماڈر نام کا۔ نازکی اسی گاؤں میں ایک پیرزادہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ماڈر میں ان کی پیدائش اور ہوش

سنبھالنے کے زمانے سے اب تک نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذرا ہے۔
نازکی کی زندگی میں بڑے نشیب وفراز آئے ہیں۔ جنہیں اگر نازکی تحریر کریں
تو ایک دلچسپ سرگزشت بن سکتی ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرینگے کیونکہ انہیں
غالباً ایک اور مکان بنوانا ہوگا۔ یا کہیں پھلوں کا باغ لگانا ہوگا۔ پھر ان کاموں
سے فرصت پا کر حج بیت اللہ شریف کو جانا ہوگا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر
بی ملازمت نے چلمن سے ان کی طرف نظارا مارا تو نازکی ان بابرکت چیز دن
سے کنارہ کش ہو کر ایک بار پھر اپنے ہی قول کے مطابق کسی سرکاری، نیم
سرکاری، سیاسی یا مذہبی ادارے میں بیٹھ کر میز دبائیں گے اور کرسیاں توڑ توڑ
کر مقبول شاہ کرالہ واری کی گلریز گنگنائیں گئے۔ نازکی جب پہلی بار معلّم
ہو گئے تو ان کی عمر ۱۶ ربرس کی تھی۔ اور وہ صرف ۸ ر جماعتیں پڑھے ہوئے
تھے ان کا مشاہرہ ۸ ر روپے ماہانہ تھا۔ لیکن نازکی نے یہیں سے ہمت اور
حوصلہ مندی کا سبق سیکھا۔ دن بھر کی محنت کے بعد وہ زرد اور مدہم روشنی میں
مزید امتحانات پاس کرنے کے لئے مطالعہ میں ڈوب جاتے۔ یہ بے بسی اور
کم مائیگی نازکی کے لئے ایک رحمت کا باعث بن گئی۔ نازکی اگر گھر سے چلے
جاتے تو وہ اپنے والد بزرگوار کی صحبت سے محروم ہو جاتے۔ ان کے والد
صاحب عربی، فارسی اور اُردو کے ایک عالم جید اور فاضل بے نظیر تھے۔ ان کا
حافظہ بے پناہ تھا۔ اپنے والد کے فیض سے نازکی کو بھی نہ صرف ان زبانوں
پر کافی دسترس حاصل ہوئی بلکہ انہیں اس علم کے علاوہ اپنے والد کے حافظے کی
بے پناہ دولت بھی نصیب ہوئی۔ نازکی کی ذاتی خوبیوں میں غالباً ان کا تیز

حافظ ہی سرفہرست ہے۔

نازکی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، ہنسی مذاق اور شعر گوئی کے علاوہ عربی، فارسی اور اُردو کے مشہور شعروں اور مقولوں سے حوالے یوں پیش کرتے ہیں جیسے سامنے رکھی ہوئی کتاب سے پڑھ رہے ہوں۔ نازکیؔ کلام اللہ، فارسی کی کلاسکی شاعر اور علامہ اقبالؔ سے جنوں کی حد تک پیار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی کٹر قسم کے ملحد کو مرد مومن بنانے کیلئے صرف یہ کافی ہے کہ حکیم مشرق علامہ اقبال کی شاعری سے اس کا ربط بڑھا دیا جائے۔ نازکیؔ کا یہ بھی خیال ہے کہ فارسی شاعری دنیا کی بہترین شاعری ہے اور جو آدمی زندگی میں صرف ایک بار شاعر بننے کی ہوس کرے اُسے تین بار فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ لیکن واقعات کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ خود نازکیؔ فارسی کے بحر بیکراں میں ڈوب کر بھی ایک اعلیٰ پائے کے اُردو شاعر نہ بن سکے (ملاحظہ ہو ان کا مجموعۂ کلام ''دیدۂ تر'') ابھی حال ہی میں نازکیؔ ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ ہوا یہ کہ انہوں نے ایک بار دفتر میں بیٹھے بیٹھے چار مینار کی خالی ڈبیا پر کشمیری میں ایک قطعہ لکھا اور جب اسے پڑھا تو اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔ سیفی کشمیری بولے یہ غریب، مفلس اور قلاش زبان اور اس خیال کی متحمل ہو سکے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ حادثہ ہو گیا جسے نازکی اپنی زندگی کا ایک المیہ کہتے ہیں اور مادری زبان کشمیری سے بہت حد تک بیزار اور غیر مطمئن ہونے کے باوجود وہ کشمیری زبان کے سخنوروں میں شامل ہو گئے۔ مرزا عارف اور نور محمد روشن کی خالص میڈان کشمیر قسم کی رباعیوں

کی دیکھا دیکھی نازکی نے بھی اس میدان میں قدم دھرا اور ڈٹ کر رباعیاں اور قطعے لکھے اور خود بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا اصلی جوہر اسی کشمیری بولی، اسی غریب زبان میں چمکا۔ فارسی اور اُردو زبانوں کا یہ شیدائی اُس دن ضرور رویا ہوگا جس دن اپنی کشمیری رباعی پر اس نے سچ مچ ہی کوئی مشاعرہ لوٹ لیا ہوگا۔ ایک ایسا مشاعرہ جہاں نہ قوالوں نے غزلیں گائی ہوں گی اور نہ ہی نعت خوانوں اور نوحہ خوانوں نے عقیدے اور مدحیہ نظمیں سنائی ہوں گی۔

نازکی کو اپنی زندگی میں اس سے بھی زیادہ المیوں کا شکار ہونا پڑا ہے۔ ریڈیو کشمیر کی ملازمت میں نازکی ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز کو دبا کر گنبد کی آواز اور جوابی حملہ لکھتے رہے۔ مرحوم نواب زادہ لیاقت علی خان کو پاکستان کا معیار تسلیم کرنے کے بعد بھی نازکی نے ایک موقعہ پر بیگم لیاقت علی خان کی دس لاکھ پونڈ والی مسکراہٹ کا پروپگنڈہ کیا۔

اس مضمون کا دوسرا حصہ حاصل نہ ہو سکا۔ جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

رحمان راہیؔ

راہیؔ وازہ پورہ کی پیداوار ہے۔ اور ان ساری اچھی بُری روایات کا وارث جو سرینگر کے اس علاقے کو دوسرے علاقوں سے ممیّز کرتی ہیں۔ راہیؔ اس محلے کی گلیوں میں پلا بڑھا اور ہوشیار عمر کو پہنچا۔ اس نے ۱۹۴۲ء میں سرینگر پرتاپ کالج میں داخلہ لیا۔ اس سے پہلے وہ اسلامیہ اسکول سرینگر میں زیرِ تعلیم رہا تھا۔ جہاں علامہ مشرق کی ''بانگ درا'' راہیؔ کے لئے بائبل بن گئی تھی، راہیؔ نے اس سال پہلی بار پکچر ہاؤس کی سیر کی، اور جب وہ مس مہتاب والی فلم ''پرکھ'' کے لئے چار آنے کا ٹکٹ خریدنے بکنگ آفس کے سامنے کھڑا ہوا۔ تو کسی ستم ظریف نے اس کے ساتھ کچھ ترقی پسندانہ قسم کا مذاق کیا۔ راہی چونکا اور اسے محسوس ہوا کہ کتاب پڑھنا برحق، لیکن یہ جو زندگی کی دوسری حقیقتیں ہیں کچھ ان سے بھی استفادہ ضروری ہے۔ حالانکہ راہیؔ کتابوں کی دنیا میں رہ کر بھی اس مادی دنیا کا گیان حاصل کرنے میں لگ گیا اور ممکن تھا کہ راہیؔ اپنے کالج کے زمانے میں ہی بہت کچھ حاصل کر لیتا۔ لیکن اسی زمانے میں اُس کی شادی ہوگئی اور اسی طرح اُس کی تعلیم کا سلسلہ

عارضی طور پر منقطع ہو گیا۔ شادی کے بعد راہی لاپتہ ہو گیا۔ دوستوں نے فاتحہ پڑھا۔ جانکاروں نے ایک آدھ بار یاد کر کے فراموش کر ڈالا اور اس طرح بات آئی گئی ہو گئی لیکن ایک دن یہ خبر اُڑتے اُڑتے سب جانکاروں تک پہنچ گئی کہ راہی بٹھنڈا کے راستے سے منزل مقصود یعنی بی اے تک آ گیا ہے۔ عجب قلابازی تھی جو راہی نے کھائی اور اس طرح اس کی ادھوری تعلیم کسی حد تک مکمل ہو گئی۔ لیکن راہی کی کہانی کلچرل کانگریس کے زمانے سے زیادہ تہ دار اور رنگ برنگی بنتی ہے یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے جب راہی نے اپنی زندگی میں پہلی بار کشمیری غزل لکھی اور دینا ناتھ نادمؔ نے اس نئے پنچھی کو کشمیری زبان کی ''والہ واتی'' میں پھنستے دیکھ کر گلا پھاڑ کر داد دی۔ کچھ دیر تک کشمیری زبان میں غزلیں اور کچھ غیر معروف سی نظمیں لکھنے کے بعد راہی نے کلچرل کانگریس کی صفوں میں اپنی اہمیت کا لوہا منوالیا۔ اور کلچر جوڑ توڑ میں لگ گیا۔ ہندی کا نقاد وشوو ھیان سنگھ چوہان اُس وقت کمیونسٹ قسم کے ادیبوں کی خالص مارکسی اور لینن وادی تنقید سے ہراساں و پریشان رہا کرتا تھا۔ چوہاں سرینگر میں ادیبوں کی شیرازہ بندی کے لئے رضا کارانہ طور پر غربت اور عسرت کی زندگی گذار رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے نقادانہ پس منظر کی مدد سے یہاں کے کبوتروں کو ایک عقلی اور منطقی نقطہ نظر دینے میں کامیاب ہو سکے گا۔ لیکن مقامی نو آموز بھی اس بات کی قسم کھائے بیٹھے تھے کہ ''ہلے نوڈ لے نو پتنہ نہ ہنہِ ژلے نو'' چنانچہ چوہان کو کئی محفلوں میں مُنہ کی کھانی پڑی۔ راہی جو اقبالیات کے بعد ان کبوتروں سے نئی نئی بولیاں سُن

رہا تھا۔خود بھی کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ کارل مارکس، کامریڈ لینن اور کامریڈ اسٹالین کے مقولے اُس کی عقل کو متاثر تو کرتے تھے لیکن اُس کا دل ان کی تائید کرنے سے قطعاً بیزار تھا۔راہی نے چوہان کی نجی بات چیت میں چوہان سے اسی بیزاری کا اظہار کیا اور ان دونوں نے مل کر ایک سازش کی۔کہ راہی نے ایک محفل میں اُردو نظم ''موت اور دوشیزہ'' پڑھی اپنے کامریڈ قسم کے نقاد اس پر چاروں کھونٹ لے کر برس پڑے اور اسے رجعت پرستی اور سامراجی ذہنیت کی ایک جیتی جاگتی نشانی قرار دیا۔راہی ساری تنقید کے دوران چپ رہا۔شودھان سنگھ چپ چاپ مسکراتا رہا، اور جب ایک ایک کر کے سارے شاعروں نے ''موت اور دوشیزہ'' کو مطعون و ملعون قرار دیا تو راہی بڑی شرافت اور معصومیت کے ساتھ گردن کو دائیں طرف ذرا سا خم دے کر اُٹھا اور بولا۔

''جناب صدر میں خود جانتا ہوں کہ یہ نظم مطعون وملعون ہے اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض کروں کہ نظم میری نہیں بلکہ آپ کے چہیتے ترقی پسند اور امن پسند روسی ادیب میکسیم گورکی کی نظم کا ترجمہ ہے اور آپ کے قبلہ کعبہ اور ان دیکھے رہبر کامریڈ اسٹالین نے اس نظم کو ترقی پسند اور امن پسند اور موت کی قوتوں کو شکست فاش دینے کی انسانی خواہش کا مظہر قرار دیا ہے۔'' راہی اتنا کہہ کر بیٹھ گیا۔اور ان جملوں کے وزن سے یہ کامریڈ قسم کے نقاد بھی یوں سمجھ لیجئے کہ چاروں شانے چت ہو گئے۔اور اس کے بعد انہوں نے کلچرل کانگریس کی ادبی میٹنگوں میں آنا

ہی چھوڑ دیا۔ دینا ناتھ نادم نے اس نئے پنچھی کو یوں پر پُرزے نکالتے دیکھا تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا؟ راہی ان کے مقابلے میں ایسے اکھاڑے میں اُترا تھا جیسے کنگ کانگ کے مقابلے میں دارا سنگھ۔ راہی اب کونگ پوش کی محفلوں میں برابر شریک ہونے لگا۔ اس کے لکھے ہوئے گیت اُس زمانے کے عوامی موسیقار نمتہ ہالی محفلوں میں گاتے۔ اور یوں ۱۹۵۳ء کا پرآشوب زمانہ آگیا۔ سری پرتاپ کالج کے ہال میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں راہی نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک مصرع کچھ یوں تھا۔

دَنو کیاہ رہبرن ایمان بدلوو

اِشارہ شیخ صاحب کی طرف تھا۔ اس پر ہنگامہ ہوا۔ ایک طرف اُردو کے فاقہ کش رباعی گو شاعر اختر زندانی راہی پر ٹوٹ پڑے۔ تو دوسری طرف ڈاکٹر محمد سلطان وانٹ مائکروفون پر کود پڑے۔ لیکن اس احتجاج کے باوجود وہ پوری غزل سنانے میں کامیاب ہوگیا اور اس طرح اُس کی ''جرأت'' اور حقیقت پسندی کا شہرہ اُن حلقوں تک پہنچا جو ۱۹۵۳ء کے واقعات کو رونما ہونے سے روکنے کے لئے دن رات ایک کر رہے تھے۔ اور انہوں نے راہی کی نہ صرف پیٹھ تھپکائی بلکہ اُسے سرکاری نوکری سے بھی نوازا۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک راہی برابر ترقی پسندوں سے منسلک رہا۔ لیکن ۱۹۵۷ء میں جب بخشی غلام محمد نے صادق گروپ کا ناک میں دم کر دیا تو راہی بھی چپکے سے ترقی پسندوں کے حلقہ اثر سے آزاد ہوگیا۔ اور اب وہ نئے شکار کی تلاش میں چل پڑا۔ اس دوران اس کی نظموں کی کتاب ''نوروز صبا'' چھپ گئی۔

اب راہیؔ کا مقصد تھا اس کتاب کے لئے ساہتیہ اکادمی کا انعام حاصل کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ حاکم وقت کی خوشنودی کے بغیر یہ انعام حاصل کرنا ناممکن تھا دروغ برگردن راوی۔ راہیؔ کا نیا شکار بخشی غلام محمد تھے۔ جنہیں جانے کیونکر راہیؔ نے پھانس ہی لیا۔ انعام حاصل کرنے کے بعد راہی نے کچھ اور قلابازیاں کھائیں۔ یہ بخشی عبدالرشید، رحمان غازی وغیرہ کے حلقہ اثر میں آ گیا۔ موئے مقدس کی تحریک میں اس نے کچھ اور کارنامے کئے۔ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے بعد اس نے ۱۹۵۳ء کی غزل پر لعنت بھیجی، اور گوشہ نشینی اختیار کی۔

آخری خبر راہیؔ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ اپنی تنخواہ کا تین چوتھائی حصہ انشورنش کی قسطوں میں خرچ کر رہا ہے اور آج کل صبح کی نماز کے وقت اپنے محلے کی گرما گرم مسجد کے حمام میں مذہب اور سیاست پر عام لوگوں کے ساتھ بالکل عوامی طریقے پر رائے زنی کرتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ راہیؔ نے اب لفظ ''ہاں'' کی افادیت کو تسلیم کیا ہے اور وہ ہر آدمی کی بات پر ایمان لاکر ''ہاں'' کہتا ہے۔ اور اس طرح اپنی عمر کا چالیسواں سال پورا کر رہا ہے۔

ستہ لال

بخشی غلام محمد اس وقت بستر علالت پر ہیں اور اُنہیں زمانے نے ایک سال کے قلیل عرصے میں تقریباً اپنے حافظے سے محو کر دیا ہے۔ لیکن انہیں کشمیر کی تاریخ کے اوراق سے باہر نہیں پھینکا جاسکتا ہے۔ ''آج جو سرگذشت اپنی کل اُس کی کہانیاں بنیں گی۔'' مولانا آزاد کا بڑا محبوب شعر تھا اور جب بخشی صاحب کے عہد کی کہانی لکھی جائے گی تو اُس میں ایک سوکھے جسم کے (مُریل) سے کشمیری پنڈت کو فراموش نہیں کیا جاسکے گا جو بخشی صاحب کے زمانۂ جلال میں اُن کی خلوتیں آباد کر کے اُن کے ذہن پر عجیب مگر بڑے طاقت اور اثرات مرتب کرتا تھا.......... رام ناتھ، غلام حسن کاؤسہ اور پنڈت ستہ لال، بخشی دور کی اس تری مورتی کے تین چہرے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بخشی صاحب کا ناتراشیدہ اور کھردرا وجودِ معنوی اس سہ رکنی لشکر کا قیدی تھا۔ اُن کے احساس کمتری اور اُن کی شخصیت کے خلاؤں نے اپنی تسکین کے لئے ان تینوں کو تراشا تھا۔

ستہ لال کے متعلق عام روایت ہے کہ وہ ایک کھاتے پیتے کشمیری پنڈت خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ ستہ لال جی کو فارسی اور علم وادب سے جو شغف ہے اُس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اپنے زمانے کے رواج کے مطابق انہوں نے اچھی تعلیم پائی ہے۔ مزاج عاشقانہ پایا تھا۔ شعر ونغمہ کے امتزاج نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ انہیں رقص وسرود سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اُس وقت تو حافظاؤں کے پازیب کی چھنک ختم ہوگئی تھی اور تاشوان کے دریچوں میں بجھی ہوئی شمعیں بزم شب کی رونق آرائیوں پر نوحہ کناں تھیں۔ لیکن یہ لطیف روایت مسخ ہو کر ''بچہ نغمہ'' کا کثیف جامہ پہن کر پھر سامنے آگئی تھی۔ نسوانی ملبوس میں ایک خوب روزادے کا یہ علامتی وجود ساز وآہنگ کے رسیاؤں کے لئے غنیمت تھا۔ وہ اس مٹی کے چراغ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے۔ انہیں نیم مہذب محفلوں میں ستہ لال جی خانقاہ سوختہ کے ایک بانکے نوجوان سے ملے۔ بخشی غلام محمد کے وجود کے اندر زندگی کی ہوس ناکیوں کا جو شعلہ روشن تھا اُس کی جوت سے وہ ناداری کے اندھیروں کو چھوڑ کر طبک ناری اور سارنگ کی ان محفلوں میں جھومنے کے لئے پہنچ گئے۔ ستہ لال اور بخشی صاحب کی طبایع کا یہ مشترکہ میلان اُنہیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔ ستہ لال جی بڑے فخر سے روایت کرتے ہیں کہ اُن دِنوں انہوں نے نادار بخشی کی بڑی دستگیری کی۔ لیکن اُنہیں ایک دوسرے سے زیادہ نزدیک لانے کے لئے ایک بڑا عجیب واقعہ ذمہ دار ثابت ہوا...... ایک

’’بچہ‘‘ کی فتنہ سامانیوں پر یہ دونوں نوجوان لٹو ہو گئے۔ محفلوں میں اُس کی چشم التفات سے فیضیاب ہونا دونوں کے غرورِ شباب کے وقار کا سوال بن گیا۔ ستہ لال نے دولت اور تحائف کے ڈھیر لگا دیئے۔ بخشی صاحب کے پاس دولت نہ تھی لیکن رندی کا حوصلہ اور بانکپن کی مستانگی تھی۔ انہوں نے اس ’’ترک غمزہ ساز‘‘ کے رقیب اور اُس کے حلقۂ سماع کو ایک مرتبہ برسر بازار پیٹ کر اپنی برتری ثابت کر دی۔ اس طرح سے بخشی صاحب اور ستہ لال کا جذبۂ رقابت دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق بعد میں انہوں نے اپنی ایک الگ سنگیت منڈلی بنائی اور یہ ’’دہرہ باج‘‘ بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس محفل میں ستہ لال جی خود ستار بجاتے تھے۔ اور بخشی صاحب گھڑا (جو کشمیری چھکری کا اہم ترین ساز ہے) سنبھالتے تھے۔ بچپن کے ان محفلوں کی یاد بخشی صاحب کو اپنے دورِ اقتدار میں Nostalgia کی حد تک ستاتی تھی۔ وہ اکثر محفل ساز و آہنگ میں ستہ لال کو ستار سنبھالنے پر مجبور کرتے تھے۔ اور خود گھڑا بجاتے تھے۔ ستہ لال جی کے سونے کے کمرے میں بخشی صاحب کی ان پوزوں میں لی گئی تصویریں بڑے نمایاں طور پر سجائی گئی ہیں۔ اور بخشی صاحب کے بعض احباب کے یہاں بھی یہ تصویریں لگی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بخشی صاحب کی ان محفل ہائے عشرت میں ستہ لال اپنے فن اور کرتبوں کے عروج پر نظر آتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر وہ کچھ اس والہانہ

انداز سے داد دیتے تھے کہ اغیار کی طبیعت بھی خوش ہو جاتی تھی۔ وہ مصنوعی وجد طاری کر کے ناچتے اور عجیب وغریب حرکات کرتے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ حرکتیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن جب وہ اس عالم مستی میں بخشی صاحب کو پادشاہم کہہ کر پکارتے تھے۔ تو بڈشاہ ثانی کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ اس مصنوعی ماحول میں وہ شیخ محمد عبداللہ، غلام محمد صادق اور ڈی پی در کو کچھ لمحوں کے لئے اپنا مصاحب سمجھ کر اس کا واقعی اس مفروضے پر یقین کر لیتے تھے کہ وہ کشمیر کے بادشاہ ہیں حاتم طائی ہیں۔

(اس کا باقی حصہ دستیاب نہیں ہوسکا اس کیلئے معذرت خواہ ہوں)۔

عبدالغنی ترالی

اگر ہم واقعات کی بنیاد اور تحریکات کے اصل مقصد سے واقف رہیں تو ہماری نگاہ تضادات کی تشریح اور تاویل کرنے میں زیادہ معتبر ہو سکتی ہے۔ آج تحریک آزادیٔ کشمیر کی سوشلسٹ بنیاد اور سیکولر کردار اس کے ترقی پسند زاویہ نظر کا شور مچانے والے نوجوانوں کو مور کی طرح رقص میں آکر اپنے سنہری پروں کی زیبائش پر اترانے سے پہلے اپنے نقطہ نگاہ کا توازن رکھنے کے لئے مور کے پاؤں کی طرف جھانکنے کی کوشش کرنی چاہئے......عبدالغنی ترالی اُس تیزی سے مٹتی ہوئی صف سے تعلق رکھتے ہیں جس کے خمیر کی گدلاہٹوں میں ہماری تحریک آزادی کا ابتدائی مزاج اپنے تمام تضادات اور کیف وکم کے ساتھ موجود ہے۔ عبدالغنی ترالی کو راجپوری صاحب گجی (کنہ گچ) کہہ کر پکارتے ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اس تشبیہ سے اُن کی شخصیت کا بڑی حد تک حق ادا ہو جاتا ہے۔ جنگل کی خودرو جڑی بوٹی کی طرح وہ نہ معلوم کب سے نیشنل کانفرنس کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی موجودگی کا بس یہی جواز ہے کہ وہ کسی طرح سے اُگ آئے...... مدتوں تک اُن کی حقیقت کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا رہا۔ لیکن آخر اُن کا خریدار آن

ہی پہنچا گچی کا سراغ پانے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا متلاشی سیاہ فام ہو......
شاید ترالی صاحب کو دریافت کرنے کیلئے بھی ضروری تھا کہ اُن کا ڈھونڈنے
والا دِل کا سیاہ اور ضمیر کا کالا ہو......بخشی صاحب نے ۵۷ء میں صادق
صاحب وغیرہ کے اخراج کے بعد پیدا شدہ قحطِ مردماں کا مقابلہ کرنے کے
لئے روی کی ٹوکری میں پڑی ہوئی اس شے کو دیکھا۔ اور آن کی آن میں
اُسے منسٹر بنا دیا۔ حالانکہ اس سے قبل ترالی صاحب برابر تین سال تک بخشی
صاحب کے اندھکار کے خلاف سینہ سپر ہو کر لڑتے رہے تھے اور ڈی پی
صاحب کو اُن سے اتنا پیار ہو گیا تھا کہ جب اُن پر فالج کا ایک ہلکا سا حملہ ہوا
تو ڈی پی صاحب انہیں نرسنگ ہوم لے آئے اور وہاں اپنی تمام سپردگیوں
کے ساتھ اُن کے زخم سہلاتے رہے......لیکن بخشی صاحب جیسے شطرنج باز
کے سامنے جس طرح ابتدائی داؤں میں ڈی پی صاحب اقتدار کی بازی ہار
گئے اُسی طرح انہیں ترالی صاحب کا داغِ مفارقت بھی برداشت کرنا پڑا۔

منسٹری کے دوران ترالی صاحب نے کچھ نئی اور انوکھی روایات قائم
کیں۔ اُنہیں ایک لمحے کے لئے بھی یہ زعم نہیں ہوا کہ وہ صاحب اقتدار
ہیں۔ اس لئے شاید اُن کے زمانہ منسٹری میں اُن سے شاید ایک بھی آدمی
ناراض ہو کر نہیں گیا ہوگا۔ عام لوگوں کی زندگی سے ترالی صاحب کا ناطہ کبھی نہ
کٹ سکا۔ اس لئے وہ کبھی بھی عوام آزاری کے ہُنر میں ماہر نہ ہو سکے۔ ٹائی
باندھنے والے اور مارکس کی کتابیں پڑھ کر بڑی بڑی جائیدادیں بنانے والے
منسٹر اُن کی سادگی پر آوازے کستے رہے لیکن ترالی صاحب کی یہ عوامی تصویر

بخشی دور کا روشن کارنامہ ہے۔ بخشی صاحب نے ترالی صاحب کی آواز تو خرید ی لیکن وہ اُن کے ایمان کا سودا چکانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ترالی صاحب بخشی وزارت کے وہ اکیلے منسٹر ہیں جنہوں نے مواقع کے باوجود کوئی جائیداد نہیں بنائی۔ جو ایک کسان کی مذہبی ہٹ دھرمی کے ساتھ دیانت کو سینے سے لگا کر خیانت اور لوٹ کھسوٹ سے دامن بچاتے رہے اور اسی لئے انہیں سوگامی صاحب کی مانند کبھی بھی بخشی صاحب کا معتمد اور روادار بننے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ دیانت کی اس بچی ہوئی چنگاری نے انہیں بخشی صاحب کا معتوب بنایا اور بخشی صاحب نے اس کا انتقام ایسے لے لیا کہ ایک مغنی عبدالغنی ترالی کو اُن سے زیادہ شہرت عطا کر کے اپنی بدشاہی کی دھاک بٹھا دی۔

اُن دنوں ترالی صاحب کا محبوب مشغلہ صوفیانہ کلام سے شغل کرنا تھا۔ اپنی بیٹھک میں جب وہ ریڈیو کھول کر کمال بٹ اور اُس کے ساتھیوں کی صوفیانہ دھنوں پر سر ہلا ہلا کر آنسوؤں کی جھڑی برساتے تھے۔ تو اُن کے پاس آئے ہوئے سائل خود ہی اُن کی طاقت کا اندازہ کر کے رفو چکر ہو جاتے تھے۔

ترالی صاحب سیاسیات کے میدان میں معجون مرکب بلکہ چوں چوں کا مربہ ہیں۔ اُنہیں شیخ صاحب کے خلوص پر بھی اعتقاد ہے۔ بخشی صاحب کی دانائی پر بھی شمس الدین صاحب کی رفاقت پر بھی اور صادق صاحب کی شرافت پر بھی۔ بخشی صاحب کو کامراجے جانے کے بعد وہ چند دِنوں کے لئے صادق صاحب کے حامی بن گئے لیکن راجپوری صاحب کی آہٹ سُن کر شمس صاحب کے گرویدہ ہو گئے۔ موئے مبارک کی تحریک میں رشید

صاحب کے آنسو پونچھنے پر ہی ترالی صاحب کو وادی اماں کا لقب عطا ہوا اور بخشی صاحب کے جیل جانے پر وہ کافی دن تک زار زار روتے رہے۔ ایک بار آئینہ ساز سے انہوں نے یہ تمثیل بیان کی کہ کوئی نئی نویلی البیلی پنگھٹ پر گھڑا لے کے جا رہی تھی کہ وہاں اُس کا پاؤں پھسل گیا۔ گھڑا گر پڑا تو بدصورت اور پھوہڑ لڑکیاں اُس نازنین پر ہنسنے لگیں۔ بخشی صاحب کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا ہے لیکن جذبات کے ان دوروں پر ترالی صاحب اب کثرتِ تجربہ سے قابو پانا سیکھ گئے ہیں جوں ہی لینڈ کمیشن کی ڈپٹی چیرٔ مینی سے پردہ سرکایا گیا۔ ترالی صاحب سر کے بل قلابازیاں کھاتے کھاتے وہاں پہنچ گئے۔

ترالی صاحب اب پیرانہ سالی کی منزلوں میں ہیں۔ لیکن ان سفید بالوں میں کبھی جوانی کا شعلہ بھی بھڑکتا نظر آتا تھا............اُن کا ذوقِ جمال اب بوڑھاپے میں صوفیانہ موسیقی کا گھائل ہو گیا ہے۔ لیکن کبھی یہ حسن کی تیر نگاہ کا بھی شکار رہا تھا۔ ترالی صاحب کی حیاتِ معاشقہ پر اب تقدس کا پردہ پڑ گیا ہے لیکن تحصیل پلوامہ کے دیہات میں یہ لطیف حکایت لوک کہانی کی سی لذت اور حلاوت کے ساتھ بیان ہوتی ہے......اور اسی لئے آج بھی تحصیل پلوامہ کے دیہات میں جب ترالی صاحب کی سبز کار خراٹے بھرتی چلی جاتی ہے تو اُن پر رومان کا لطیف موڈ طاری ہو جاتا ہے۔ اور ان کی تقریر میں نغمگی کا زیر و بم پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا رومیؔ نے یونہی نہیں کہا تھا۔

السلام اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

پشکر بھان

شیخ چلی کے بعد اگر کسی نام کے زبان سے ادا ہوتے ہی کشمیری زبان جاننے والوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھل جاتی ہے تو وہ مچامہ'' ہے ''مچامہ'' بیسویں صدی کے کشمیر کا کردار ہے اور ہماری موجودہ معاشرت کی پیداوار۔ نئی تہذیب کا جو پرتو ہماری قدامت پسند سوسائٹی پر پڑ رہا ہے اُس کی وجہ سے نئی اور پرانی قدروں میں ایک عجیب آویزش پیدا ہوگئی ہے۔ اس آویزش کے کچھ سنجیدہ پہلو ہیں۔ لیکن اس کے کچھ مضحکہ خیز پہلو بھی ہیں۔ مچامہ اسی ''مضحکہ خیزیت'' کی علامت ہے۔ اسی لئے اس کردار کی حماقتوں میں ہمارے معاشرے کے بہت سے افراد کو اپنی حماقتوں کا عکس نظر آتا ہے۔ یہی مچامہ کی کامیاب تخلیق کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

پشکر بھان مچامہ کا خالق ہے۔ لیکن جس طرح شرلاک ہومز اپنے خالق سر آرتھر کانن ڈائل سے زیادہ مشہور ہے۔ اسی طرح مچامہ نے پشکر بھان کی ذاتی حیثیت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ دور کیوں جایئے خود ہندوستان میں فوجی کے کردار کو لے لیجیۓ جس نے اپنے مورت گرلوتن ناتھ

سرشار کا نام پردۂ گم نامی میں دھکیل دیا ہے۔ امتدادِ زمانہ کی گرد میں اسی طرح پشکر بھان کا جسم غائب ہو جائیگا۔ لیکن اس کی رُوح مچامہ کی علامت میں زندہ رہے گی۔

مچامہ کی کردار نگاری کا حال سن کر ذہن میں اس مضحکہ خیز کردار کی جو تصویر اُبھرتی ہے پُشکر بھان کا وجود اُس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ پتلا چھریرے جسم کا آدمی۔ جس کی ٹانگیں زمین کے ساتھ زاویہ قائمہ بنانے کے بجائے زاویہ حادہ بناتی ہیں۔ اُس کی گردن بھی اُس کے کاندھوں کے ساتھ ۴۵ درجے کا زاویہ بناتی ہے اوراس کی ناک چہرے پر اُسی طرح اینٹھی بیٹھی ہے جس طرح کوئی بدمزاج بیوی اپنے خاوند سے جھگڑا کر کے اینٹھتی ہے۔ جسمانی ساخت ہی ''مچامہ'' سے اُس کی واحد مشابہت نہیں ہے بلکہ ذہنی کوائف اور عادات میں بھی ''مچامگی'' کے عناصر شامل ہیں۔ پشکر بھان نے اس سلسلے میں ریڈیو سماروہ کے سلسلے میں نئی دہلی کا جو سفر بلکہ Odyssy اختیار کی اُس کی تفصیلات اب سرینگر کے نوجوانوں کے لوک ادب کا حصہ بن گئی ہیں۔ اس کی جزئیات کوئی قلم بند کردے تو فوجی کی ''قرولی'' بھول جائیگی۔ خاص طور پر پشکر نے اس سفر میں اپنا ساڑھے ستائیس من وزنی اور پانچ گز لمبا بسترہ اور مشہور عالم ٹرنک ساتھ لیا تھا اُن کی رُوئیداد تو بذات خود ایک مہابھارت کا سامان مہیا کر سکتی ہے۔

پشکر بھان اب ریڈیو سے اچھی خاصی تنخواہ پاتا ہے۔ لیکن اُس کا افلاس (افلاس تخیل نہیں جو بعض بزرگ کرمفرماؤں کا حصہ ہے) اُس کا

ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اس کا اکلوتا کوٹ، اُس کی بے کسی کا گواہ ہے اور جب کبھی
کسی سفر پر جانے کی نوبت آتی ہے۔ پشکر کے دوستوں کی شامت آجاتی
ہے۔ جس کسی کا کوٹ، قمیض یا پتلون اُس کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ اُس وقت
تک واپس نہیں کی جاتی۔ جب تک کہ تار تار ہو کے عاشق کے گریبان کی
طرح دُھائی نہ دے۔

پشکر ایک اچھا اداکار ہے اور ''مچامہ'' کی مقبولیت میں پشکر کی ادا
کارانہ صلاحیتوں کا بھی بہت دخل ہے۔ خاص طور پر اُسے آواز اور لہجے کے
اُتار چڑھاؤ پر جو قدرت حاصل ہے۔ وہ اُسے مزاحیہ کرداروں کے لئے
خاص طور سے زیادہ کامیاب بناتی ہے۔ اُس کے مزاح میں خیال کے مزاح
سے زیادہ اداکاری کا کمال جھلکتا ہے۔ اور یہ اس لحاظ سے اُس کے حق میں
اچھا ہوا۔ کیونکہ ابھی ہمارے یہاں ظرافت کی عام سطح زیادہ بلند نہیں ہے اور
اُس کا ہلکا ہلکا اور اوپری اوپر کا مزاح سبھوں کی سمجھ میں آ کر اُنہیں لطف اندوز
کر دیتا ہے۔

پشکر بھان کے ڈرامے دراصل Act کرنے کی چیزیں ہیں۔ اور
Action میں ہی اُن کا جادو چل جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے کسی نے پشکر کو کہہ
دیا ہے کہ اُس کا مزاح کتاب کے سرحروف کی صورت میں بھی اتنا ہی متاثر
کرسکتا ہے۔ جو کہ عام طور صحیح نہیں ہے۔ پشکر بھان کی ایک بدنصیبی جو حال
ہی اُن کے پیش آئی ہے یہ ہے کہ اُسے اپنے ریڈیو کے سابق کولیگ علی محمد
لون نے کشمیری فلم ''مہندی رات'' میں ولن کا رول دیا ہے۔ غالباً یہ سوچ کر

کہ پشکر وِلن کے رول میں نہ صرف ناکام ہوگا بلکہ تماشائیوں میں بدنام بھی۔
لیکن فلم میں کام کرنے والے لوگوں کا بیان ہے کہ پشکر نے اس سازش کو بھی ناکام کردیا اور وِلن کا رول کچھ اس صفائی اور مہارت سے کیا کہ فلم کا ہیرو اور ہیروئن کا باپ دونوں اس کو دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہیں۔ معتبر ذرائع سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ فلم کی نمائش میں تاخیر ان دو حضرات کی مشترکہ سازش کا نتیجہ ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پردہ سیمین پر بھی پشکر ان دونوں کو اسٹیج کی طرح شکست فاش دے۔ لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیجئے کہ پشکر بھان اب فلم کے اثر کے تحت واقعی ایک وِلن کی طرح Act کرنے لگا ہے اور اپنے ساتھی سنگھیوں کو دھوکہ دے کر چوری چھپے گھر جاتا ہے اور رات کو کسی ٹھرے کی دکان پر بے ہوش پایا جاتا ہے۔

ذاکرِ صاحب

ڈاکٹر ذاکر حسین کی موت سے جمہوریہ ہند ایک ایسے صدر سے محروم ہوگئی، کہ جس کی دل آویز شخصیت نے منصب صدارت کی توقیر بڑھادی تھی۔ ان کی علمیت، متانت، سنجیدگی اور بلند نظری نے انہیں سب کا محبوب بنادیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کے صدر منتخب کئے جانے کی سخت مخالفت کی تھی، وہ آج ان کی موت کا ماتم کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ذاکر صاحب کے انتخاب سے جہاں یہ بات ثابت ہوگئی کہ اکثریت کا دل اپنی جگہ پر قائم ہے۔ وہاں ان کی بے پناہ منفرد شخصیت نے یہ بھی ثابت کردیا کہ ان کا انتخاب کر کے ہندوستان نے اپنی عزت اور توقیر میں اضافہ کردیا تھا۔ ان کی موت سے صدارت ہی کا منصب خالی نہیں ہوا ہے۔ علم و ادب تاریخ و معاشیات، فکر و نظر اور تعلیم و فلسفہ کی دنیا بھی ویران ہوگئی ہے۔ ان کے بعد اب نگاہِ انتخاب کسی پر ٹھہرتی ہی نہیں۔ انہوں نے صدارت کے منصب کو اتنا اونچا کردیا تھا کہ ہندوستان میں اب کوئی شخص اس کے اہل نظر نہیں آتا۔

ذاکر صاحب کو سیاست سے دلچسپی ضرور تھی، لیکن انہیں سیاستدان کہنا صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ انہوں نے سیاست کو کبھی اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ اسی لئے اپنی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کے باوجود وہ لیڈر نہ بن سکے۔ تمام عمر معلم ہی رہے اور انہیں اپنی محرومی پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ بلکہ ۱۹۶۷ء میں جب انہیں صدارت کے لئے منتخب کیا گیا تو انہوں نے صدر کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر میں اپنے معلم ہونے پر زور دیا اور کہا "میری عزت افزائی دراصل ایک معلم کی خدمات کا اعتراف ہے"۔

ذاکر صاحب کا ذہن مغرب سے ضرور متاثر تھا لیکن ان کی زندگی مشرق کی شرافت، وضع داری، خلوص، انکسار اور وسیع المشربی کا ایک ایسا نمونہ تھی کہ انہیں مشرقی تہذیب کا بہترین نمائندہ قرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ذاکر صاحب کو مغرب کی علمی، فکری اور تہذیبی فتوحات کا اعتراف تو تھا لیکن وہ اسے کبھی مغلوب نہیں ہوئے اور اسی لئے انہیں اپنے مسلمان ہونے پر کبھی معذرت خواہ نہیں ہونا پڑا۔ انہیں فخر تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کے علم وعرفان اور ایمان وایقان کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ انہیں اپنی قوم پرستی کا ثبوت دینے کے لئے اپنے مذہب اور اپنی روایات سے بیزاری ظاہر کرنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کو کبھی سیاسی سودا بازی کے لئے بھی استعمال نہیں کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے عروج کی کہانی جہد مسلسل، عمل پیہم اور خلوص وایثار کی ایک ایسی سبق آموز داستان ہے کہ ہندوستان کی صدارت اس کا منطقی انجام، معلوم ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت میں فلسفے اور معاشیات کی خشکی ہی نہیں، علم و ادب اور شعر و سخن کی رنگ آمیزی بھی ہے۔ وہ زاہد خشک نہ تھے، رند پارسا تھے۔ وہ ۱۹۲۱ء میں برلن میں معاشیات کے موضوع پر ڈاکٹریٹ بھی حاصل کر رہے تھے۔ اور دیوان غالبؔ کو ترتیب بھی دے رہے تھے۔ انہوں نے ارسطو کی ری پبلک کا ترجمہ بھی کیا اور بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھیں۔ وہ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بھی رہے اور ہندوستان کے صدر بھی۔ ان کے مذاق اور مزاج کا یہ ظاہری اختلاف دراصل ان کی ہمہ گیر اور دیوزاد شخصیت کا اعجاز ہے۔ اور ذاکر صاحب کے ہر سوانح نگار کو یہ مشکل آن پڑیگی کہ وہ ان کی شخصیت کے کس پہلو پر زور دے۔ اتنی پہلو دار، جامع اور بھرپور شخصیت سے انصاف کرنے کے لئے سوانح نگار کو بھی بلند فکر، بلند نظر اور عالی ظرف ہونا چاہیے ڈاکٹر ذاکر حسین کے علمی، تہذیبی اور ادبی کارناموں کا صحیح تجزیہ کرنے میں ابھی کچھ وقت لگے لگا۔ لیکن ان کا دوسالہ دورِ صدارت ہندوستان کی صدارتی تاریخ میں ایک مثال بن کر رہے گا۔ وہ ایک انتہائی نازک دور میں صدر منتخب ہوئے اور ان کے صدر منتخب ہونے سے پہلے ہی مرکز اور ریاستوں کے درمیان رسہ کشی شروع ہوگئی تھی۔ ذاکر صاحب کے تدبر، ان کی عاقبت اندیشی اور عالی ظرفی کا ہی کمال ہے کہ اس کشمکش میں بھی ان کی ذات، جھگڑوں اور جھمیلوں سے بلند رہی اور بعض اوقات ان کے حسن تدبر نے ہی اُلجھے ہوئے معاملات کو سلجھا دیا۔ آئین کی رُو سے ہندوستان کا صدر محض ایک نمائشی سردار ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے بدلتے ہوئے

سیاسی جغرافیہ نے اس منصب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے جانشینوں کے لئے کچھ اچھی روایات قائم کی ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ ان کے جانشین کہاں تک ان روایات کو آگے بڑھا سکیں گے۔ ذاکر صاحب چلے گئے، لیکن راشٹر پتی بھون میں ان کے کھلا ہوئے گلابوں کی خوشبو بہت دیر تک قائم رہے گی۔ وہ ہندوستان کے سیکولرازم اور اس کے ترقی پسند مزاج کی سب سے حسین اور تابندہ علامت تھے۔ ان کی موت سے راشٹر پتی بھون کے گلاب ہی نہیں، نشاط اور شالیمار کے پھول بھی اُداس ہیں کہ اب ان کا کوئی شیدائی نہیں رہا۔ ہندوستان کو صدر تو بہت سے مل جائیں گے لیکن ذاکر صاحب کا ملنا دشوار ہے۔ راشٹر پتی بھون کو بہت دنوں تک کسی ذاکر حسین کا منتظر رہنا پڑے گا۔

شیام لال کول

شیام لال کول مختصر افسانے کے نہیں بلکہ ایک بھرپور ناول کے کردار ہیں۔ وہ سیاسی دُنیا کے نہ سہی لیکن ریاست کی سماجی زندگی کی سب سے Controversial شخصیت ہیں۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے اعتبار سے انہیں ریاستی انتظامیہ کے کسی کلیدی عہدے پر فائز ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اپنے کردار کی کمزوریوں کی بناء پر وہ ہر تین ماہ کے بعد کسی نہ کسی عتاب کا شِکار ہو جاتے ہیں۔

شیام جی اپنے منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے، لیکن اُس زمانے کے معیار کے مطابق ان کے کنبے کا شمار کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ان کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی اور اپنی نوجوانی میں وہ خاصے بانکے سمجھے جاتے تھے۔ باپ کے لاڈ اور زندگی کی آسائشوں نے شیام جی کی توجہ تعلیم سے ہٹا کر ظاہری رنگ و رُوپ اور نمائشی چیزوں کی طرف مبذول کر دی اور نتیجے کے طور پر وہ باقاعدہ تعلیم سے محروم رہ گئے۔ زندگی کی لذتوں اور عشرتوں کو زندگی کا مقصد سمجھ کر شیام جی نے اپنی منزل متعین کر دی ...... اور ان کی ساری زِندگی اسی منزل کی تلاش میں گذری

ہے۔ وہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے۔ لیکن پچھلے کئی سال سے انہیں پے در پے اتنی ناکامیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ زِندگی کا ذائقہ کچھ تلخ سا ہو گیا ہے۔

شیام جی بڑے ذہین طباع، حاضر جواب اور مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ سیاست سے ان کی دلچسپی کسی گہرے سیاسی فلسفے سے وابستگی کی بِناء پر نہیں تھی بلکہ بعض سیاسی شخصیات سے ان کے ذاتی مراسم کا نتیجہ تھی۔ شیخ صاحب سے ان کی پہلی ملاقات غالباً ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ اِن دِنوں وہ ایک اوسط درجے کے کلاتھ مرچنٹ تھے۔ پہلی ہی چند ملاقاتوں میں اس بانکے نے شیخ صاحب کو متاثر کر دیا اور شیخ صاحب سے ذاتی تعلقات کی استواری شیام جی کو سیاست کے کارزار میں کھینچ لائی۔ مسلم کانفرنس کے نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہونے پر شیام جی کانفرنس کے سرگرم رُکن ہو گئے۔ اب وہ کلاتھ مرچنٹ سے فارسٹ میسی ہو گئے تھے اور قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں اُنہوں نے شری ڈی پی در کے ساتھ پشاور میں پنڈت جواہر لال نہرو کا استقبال کیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب بخشی صاحب اور صادق صاحب لاہور میں مقیم تھے۔ تو شیام جی بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ وہاں کشمیر چھوڑ دو تحریک کی پبلسٹی کے سلسلے میں شیام جی نے قابلِ ذکر کارنامے انجام دئے۔ ۱۹۴۷ء میں ریاست میں داخل ہوتے ہوئے اُنہیں گرفتار کر لیا گیا۔ پاک حملے کے نتیجے کے طور پر جب شیخ صاحب کو رہا کر کے ایمرجنسی ایڈمنسٹریشن کا ناظم اعلےٰ مُقرر کیا گیا تو شیخ صاحب نے شیام جی کا انتخاب

اپنے پرائیویٹ سکریٹری کے طور پر کیا یہ ان کے عروج کا نقطہ عروج تھا۔ رینجنیا ہوٹل کے اوپریشن ہیڈ کواٹر میں شیخ صاحب سے ملاقات کی سعادت کے ۔لئے شیام جی کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری تھی۔ شیام جی نے اپنی ذہانت اوراپنی بذلہ سنجی سے شیخ صاحب کا اعتماد ہی نہیں، ان کی محبت بھی حاصل کی تھی...... اِنہی دِنوں اُنہوں نے فٹ پاتھ پر گاڑی چڑھا کرایک مسافرکوزخمی کردیا تھااور جب ان کی اس لاپرواہی کے لئے باز پرس ہوئی تھی توشیام جی نے غصے میں جواب دیا تھا کہ کم بخت کیوں غلط فٹ پاتھ پر چل رہاتھا......

اس کے بعد شیام جی وزیٹرس بیورو کے ڈائیریکٹر مقرر ہوئے اور ۱۹۵۳ءکوشیخ صاحب کی گرفتاری کے بعدانہیں بھی نظر بند کردیا گیا۔رہا ہوکر وہ کچھ عرصے کے لئے جموں میں سول لیزان آفیسر مقرر ہوئے اور پھراُنہیں ڈائیریکٹر ٹورازم کا عہدہ سونپ دیا گیا، یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ اپنے اِرد گرد کام کرنے والوں کے انتخاب میں بخشی صاحب اور شیخ صاحب کی پسند میں زیادہ فرق نہ تھا۔جلد ہی شیام جی بخشی صاحب کے منظورِنظر بن گئے اور اُنہیں بخشی صاحب سے دیوانگی کی حدتک عشق ہوگیا۔ وہ اکثر جھوٹی سچی قسمیں کھانے کے لئے بخشی صاحب ہی کی قسم کھایا کرتے ....لیکن بخشی صاحب سے شیام جی کا یہ ”ہنی مون“ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ بخشی صاحب کے راج دلارے بخشی عبدالمجیداورشیام جی کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوگیااور شیام جی کا پتہ کٹ گیا۔انہیں ڈائیریکٹر ٹورازم کے عہدے

سے ہٹا کر بطورِ سزا کے ڈپٹی ڈائیریکٹر پرچیز زاینڈ سٹورز بنایا گیا۔ یہ تقریباً
شیام جی کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم ثابت نہ ہوا اور راویوں کا کہنا ہے کہ
اس حیثیت میں شیام جی کی آسودگی اور فارغ البالی میں قابل ذکر اضافہ
ہوا۔لیکن بخشی صاحب کے دور میں جب عتاب شاہی نازل ہوا کرتا تھا تو اس
کی کوئی حد مقرر نہ تھی، شیام جی کو اپنی پوزیشن سے یوں مطمئین دیکھ کر بخشی
صاحب نے ایک اور شب خون مارا، اُنہوں نے غیر متوقع طور پر دفتر کا
معائنہ کیا اور شیام جی کو غیر حاضر پا کر اُنہیں معطل کر دیا۔شیام جی کے لئے یہ
معطلی نا قابلِ برداشت تھی ۔ اُنہوں نے اپنی گز بھر لمبی زبان کو(Round
the clock) چلا کر اپنی کشتیاں مکمل طور پر جلانے کا سامان کر لیا۔ اس
مرحلے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اُن کے سب سے عزیز دوست
پیرزادہ غلام احمد (اُس وقت کے چیف سیکریٹری) نے بھی شیام جی سے قطع
تعلق کر لیا۔ اسی دوران میں انقلاب آگیا اور شیام جی نے خواجہ شمس الدین
کی چھتر چھایا میں پناہ لینا چاہی۔ اس کے لئے بخشی صاحب کی تعریفیں کرنا
بھی ضروری تھا۔ ان سے اپنی محبت جتانا بھی لازمی تھا۔شیام جی نے اپنی
قسمت سنوارنے کے لئے زہر کا یہ پیالہ بھی پی لیا۔ وہ میونسپلٹی کے ایڈمنسٹریٹر
مقرر ہو گئے اور آج سے صرف ایک ماہ پہلے تک ایڈمنسٹریٹر ہی تھے۔ پچھلے
دِنوں حسب معمول ان پر ارباب اقتدار کا عتاب نازل ہوا اور انہیں حکم دیا گیا
کہ میونسپلٹی سے سیدھے چیف سیکریٹری کے دفتر کا رُخ کریں اور وہاں بیٹھ
کر جہلم میں اُٹھتی ہوئی لہریں گنا کریں۔ آج کل وہ بٹہ مالنہ کے آتشزدگاں

کی امداد کے لئے قائم کردہ ریلیف کیمپ کے انتظامات کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ بعض لوگ اس لئے مارے جاتے ہیں کہ ان کی زبان چھوٹی ہوتی ہے وہ زیادہ بات نہیں کر سکتے۔ شیام جی ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی لمبی زبان کی وجہ سے مارے جاتے ہیں۔ ان میں بڑے گُن ہیں۔ وہ نہایت ہی دل چسپ زندہ دل اور یار قسم کے آدمی ہیں وہ جب کوئی کام کرنے پر آتے ہیں تو دُنیا میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ واجبی سی تعلیم کے باوجود وہ بڑی عمدہ انگریزی بولتے ہیں۔ پبلک ریلیشنز آفیسر کی حیثیت سے ان کا جواب نہیں۔ وہ اَن تھک کارکُن ہیں لیکن ان کی سب سے بڑی دُشمن ان کی اپنی زبان ہے انہیں باتیں کرنے کا بے حد شوق ہے اور جب ان کی زبان کھلتی ہے تو پھر اُنہیں کسی بات کا امتیاز نہیں رہتا اور کشمیر میں پچھلے سولہ سترہ سالوں میں بات کا بتنگڑ ابنانے والوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو ایک بات میں دس باتیں مِلا کر ارباب اقتدار کے کانوں میں اپنے دُشمنوں کے خلاف زہر گھولتا رہتا ہے۔ شیام جی اگر صرف ایک سال کے لئے خاموشی کا برت رکھ سکتے تو ان کی بگڑی ہوئی تقدیر سنور سکتی ہے لیکن یہ ان کے لئے ناممکن ہے۔ خُدا کا شکر ہے کہ وہ ہکلاتے ہیں اور اسی ہکلاہٹ میں زہر کی آدھی شدت کم ہو جاتی ہے۔ اب شیام جی کے مزاج میں چڑچڑاپن اور بوکھلاہٹ آ گئی ہے۔ غالباً یہ مسلسل ناکامیوں اور محرومیوں کا اثر ہے لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایڈمنسٹریٹر میونسپلٹی کے عہدے سے ہٹانے پر اگر شہر کے کسی طبقے نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو وہ شہر کے خاکروب تھے۔

کچھ یادیں

میر واعظ محمد عبداللہ شوپیانی (مرحوم)

یہ فروری ۱۹۶۹ء کا ذکر ہے۔

فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف پاکستان میں بڑی زبرست تحریک چل رہی تھی اور لاہور اس تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مال روڑ پر دن میں کئی بار تیس چالیس ہزار افراد پر مشتمل جلوس صدر ایوب کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز اور اہانت آمیز نعرے بلند کرتے ہوئے گذرتے، ان دنوں پاکستان بھر میں ذوالفقار علی بھٹو کا طوطی بول رہا تھا اور ایوب خانی نظام آخری ہچکیاں لیتا ہوا نظر آتا تھا۔ میں کئی دن تک بڑی حیرت کے ساتھ آمریت کے خلاف پاکستانی عوام کے جوش اور جذبے کے ان ہیجان انگیز مظاہروں کو دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک دن ان کی یکسانیت سے گھبرا کر میں نے میر واعظ شوپیان مولوی محمد عبداللہ شاہ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ میرے چچا مولوی عبدالرحیم نے مجھے بتایا تھا کہ میر واعظ ان کے بڑے دوست ہیں اور وہ مجھے ان سے ملائیں گے۔ یہ غالباً جمعہ کا دن تھا اور لاہور شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ شورش کاشمیری کی قیادت میں نکلے ہوئے جلوس پر پولیس نے لاٹھی چارج

کیا تھا۔ جس سے جلوس تو تتر بتر ہو گیا تھا۔ لیکن مظاہرین گلیوں میں گھس
گھس کر پولیس پر پتھراؤ کر رہے تھے۔ چار بجے کے قریب حالات سُدھر
گئے اور میں مولوی صاحب کے ہمراہ میر واعظ صاحب کی قیام گاہ کی طرف
روانہ ہوا۔ میں نے چچا عبدالرحیم سے کہا تھا کہ وہ میر واعظ سے میرا تعارف
نہ کروائیں۔ میں ان کی یاداشت کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ بہت سے گلی کوچوں
سے گذر کر جب ہم میر واعظ کے دروازے پر پہنچ گئے تو چچا۔ نے رحیم آواز دی
اور اندر سے ایک مانوس جانی پہچانی آواز ابھری۔
''اندر تشریف لائیے مولوی صاحب'' یہ میر واعظ شوپیان مولوی
عبداللہ شاہ کی آواز تھی۔ جو میں آج پورے بائیس برس بعد سن رہا تھا۔
اندر ایک کمرے میں میر واعظ اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے
ساتھ کھیل رہے تھے، ایک کونے میں ایک ''پرانا صوفہ اور دو کرسیاں پڑی
ہوئی تھیں۔ میر واعظ کے چہرے پر کاروان عمر رفتہ کے نشانات صاف نظر
آرہے تھے۔ ان بائیس برسوں میں وہ کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ لیکن آواز کا
وقار اور اس کی گرج آج بھی وہی تھی۔ چچا رحیم نے میری طرف اشارہ
کرتے ہوئے شاہ صاحب سے پوچھا کہ انہیں پہچانئے یہ کون ہیں؟
میر واعظ بہت دیر تک سوچتے رہے لیکن انہیں یاد نہیں آیا۔ پھر چند لمحوں بعد
جب رحیم صاحب نے میرے والد کا نام لیا تو میر واعظ اپنی نشست سے
اچھل کر میرے قریب آ گئے۔ مجھے گلے سے لگایا اور آنسو پونچھتے ہوئے
مولوی عبدالرحیم سے کہنے لگے۔ کہ یہ تو اپنا شمیم ہے۔ یعقوب صاحب کا

بیٹا''۔ میرے والد میر واعظ صاحب کے بڑے زبردست مخالف تھے۔ وہ سخت نیشلسٹ تھے۔ اور میر واعظ صاحب سخت مسلم کانفرنسی، ملک کی تقسیم سے پہلے شوپیان میں بڑے سیاسی معرکے ہوا کرتے تھے۔ اور والد مرحوم جو بہت اچھے مقرر سمجھے جاتے تھے۔ میر واعظ صاحب کے خلاف بڑی زوردار تقریریں کیا کرتے تھے۔ پھر جمعہ کے دن میر واعظ جامع مسجد میں اس تقریر کا جواب دیا کرتے اور اس طرح بازار سیاست میں بڑی گرما گرمی رہتی۔ لیکن اس تقریری مخالفت اور سیاسی ہنگامہ آرائی کے باوجود والد مرحوم اور میر واعظ کے ذاتی تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ میر واعظ بڑی دلچسپ اور رنگین شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی آواز میں بلا کا جادو تھا۔ اور وہ جب لحن داؤدی میں تلاوتِ کلام پاک کیا کرتے تھے۔ تو پتھر دل بھی موم ہو جاتے۔ علاقہ شوپیاں کے دیہاتی عوام پر ان کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اور یہ ان ہی کی ہمت تھی کہ وہ اس دور میں بھی کہ جب شیخ محمد عبداللہ کشمیر میں سب سے بڑی ناقابل تسخیر سیاسی قوت سمجھے جاتے تھے۔ ان کے خلاف صف آراء ہو گئے اور ایک بار شوپیاں میں شیخ صاحب کی آمد پر ان کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کروایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار شوپیاں کے قلعہ باغ میں بیک وقت دو جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ ایک جلسے سے شیخ صاحب خطاب کر رہے تھے اور دوسرے جلسے سے میر واعظ محمد عبداللہ شاہ شوپیانی، یہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ اپنے بزرگوں کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی میر واعظ صاحب کے خلاف تقریریں جھاڑنا شروع کر دیں۔ اور ان کی فرقہ پرستی،

تنگ نظری اور ملائیت پر طنز کرنا شروع کر دئے اور جب میر واعظ تک ہماری گستاخیوں اور تیراندازی کی خبریں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ تو انہوں نے ہم سے ناراضگی کا اظہار کرنے کی بجائے کچھ زیادہ ہی التفات دکھانا شروع کیا۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی۔ وہ اس خوش اخلاقی اور مروت سے پیش آتے کہ رفتہ رفتہ مجھے اپنی زیادتیوں اور بے ادبی کا احساس ہونے لگا۔ اور صرف اس خیال سے کہ میر واعظ سے دوسرے دن ملاقات ہوئی تو وہ کیا کہیں گے، میں نے ان کے خلاف تقریروں کا سلسلہ بند کر دیا۔ حالانکہ میر واعظ صاحب نے ایک بار بھولے سے بھی میری گرم گفتاری کا ذکر نہیں کیا۔ شدید سیاسی اختلافات اور عقائد کے ٹکراؤ کے باوجود افراد کے ذاتی تعلقات کا متاثر ہونا ضروری نہیں۔ یہ سبق میں نے سب سے پہلے میر واعظ شوپیاں مولوی عبداللہ شاہ سے ہی سیکھا ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں۔ کہ میر واعظ اس معاملے میں اپنے ہاں کے بڑے بڑے لیڈروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع القلب اور دور اندیش واقع ہوئے تھے۔

پھر ایک دن آزادی آ گئی اور مولوی عبداللہ شاہ گرفتار کر لئے گئے۔ شاہ صاحب کی گرفتاری، شوپیان کی تاریخ میں ایک ایسا غیر معمولی واقعہ اور سانحہ تھا کہ آج تیس برس بعد بھی یہاں کے لوگ اسے فراموش نہیں کر پاتے ہیں اور میں نے آج بھی مولوی صاحب کے ذکر سے اہل شوپیاں کی آنکھوں کو نم ہوتے دیکھا ہے۔ وہ اس قصبے کی شان اور اس کی آبرو تھے اور ان کے دم قدم سے یہاں کی سیاسی سرگرمیوں اور مذہبی زندگی کی رونق قائم تھی۔ وہ

بہت اچھے مقرر اور بہت موثر واعظ خواں تھے۔ اور ان کا حلقہ اثر صرف شوپیاں تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ مسلم کانفرنس کے بڑے سرکردہ رہنما تصور کئے جاتے تھے اور ان کے سیاسی عقائد سے اختلاف رکھنے والوں کو بھی ان کی شخصیت کی جادوگری اور ان کے سیاسی اثر ورسوخ کا اعتراف تھا۔ میر واعظ صاحب دیہاتیوں کو ''کندہ ناتراش'' کہا کرتے تھے۔ اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ان ''کندہ ہائے ناتراش'' کو تراش کر انہیں انسان بنانے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ جب کشمیر کے سینکڑوں بہترین دماغوں اور اپنے بہت سے سیاسی حریفوں کو پاکستان بھیج کر ہمارے رہنماؤں نے اپنی راہ کا ہر کانٹا صاف کرنے کا فیصلہ کیا۔ تو میر واعظ شوپیاں بھی پاکستان پہنچ گئے۔ پاکستان میں ان پر کیا گذری، مجھے اس کی تفصیلات معلوم نہیں۔ لیکن بائیس برس بعد جب لاہور میں میری ان سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے ایک جملے میں اپنی حکایت بیان کر دی۔

انہوں نے کہا۔

''اس ملک میں ہمیں بے پناہ دولت بھی ملی، اور ہر طرح کی راحت بھی، صرف عزت نصیب نہیں ہوسکی۔ اور اسی لئے ہم وطن لوٹنے کو تڑپ رہے ہیں۔''

میر واعظ نے ایک پنجابی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس خاتون سے ان کے بچوں کی تعداد سات آٹھ سے بھی زائد ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایک گھنٹے کی ملاقات میں، میں نے مختلف عمروں

کے آدھ درجن سے زیادہ بچے دیکھے۔ میر واعظ صاحب، چچا رحیم کے وجود کو بھول کر مجھ سے بڑی دیر تک شوپیاں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ فلاں شخص اب کہاں ہے؟ سُنا ہے کہ فلاں آدمی مر گیا ہے؟ وہاں کی سڑکوں کا کیا حال ہے۔ جامع مسجد کی تعمیر کس مرحلے میں ہے؟ اب وہاں کتنے اسکول ہیں" وہاں کے لوگوں کی اقتصادی حالت کچھ بہتر ہوئی ہے یا نہیں؟ یہ اور اسی قسم کے درجنوں سوالات پوچھ کر بھی ان کی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مجھ سے مل کر ان کی پرانی یادوں کے سمندر میں ایک طوفان کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور وطن لوٹنے کے جس امکان کو انہوں نے تھپکیاں دے دے کر سُلا دیا تھا۔ وہ کچھ اس شدت سے بیدار ہو گیا تھا۔ کہ اسے دوبارہ سُلانے کے لئے بڑی مدت درکار ہوگی۔ میر واعظ نے بار بار مجھ سے پوچھا۔ کہ کیا غلام محمد صادق (جو اُن دنوں ریاست کے وزیر اعلیٰ تھے) انہیں چند دنوں کیلئے اپنے گھر لوٹنے کی اجازت دینے پر آمادہ ہوں گے؟ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں ان کی طرف سے یہ پیغام دوں۔ کہ ہم صرف چند ہفتے قیام کریں گے...... مزید اطمینان کی غرض سے انہوں نے یہ اطلاع بھی فراہم کردی۔ کہ پاکستان میں ہماری اتنی زمین جائیداد ہے کہ ہمیں اس کی دیکھ بھال کے لئے بہر حال لوٹنا ہی پڑے گا۔ مجھے میر واعظ صاحب کے درد اور کرب کا اندازہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی مجبوریوں کا بھی احساس تھا...... اس لئے میں انہیں جھوٹی تسلی بھی نہ دے سکا۔ میر واعظ صاحب کے ساتھ پاکستان میں یہ میری پہلی ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوگئی۔ روانہ

ہونے سے پہلے انہوں نے بہت سے لوگوں کے نام پیغامات دیئے۔ اور مجھے نمناک آنکھوں سے رخصت کرتے ہوئے کہا کہ میں اب خدا سے صرف یہ دُعا کرتا ہوں کہ مجھے اپنے وطن کی مٹی نصیب ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر واعظ کی یہ دُعا بھی قبول نہیں ہوئی۔ اور وہ پچھلے دنوں دیارِ غیر میں اجنبی زمین کی آغوش میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔ میر واعظ کی موت نے ایک بار پھر بہت سے ان زخموں کو ہرا کردیا ہے کہ جو وقت کے مرہم نے دھندلا دیئے تھے۔

خبطی

''وہ خبطی ہے'' ایک انجینئر نے کہا

''وہ پاگل ہے'' ایک کانگریسی ٹھیکیدار نے کہا ''وہ اُلّو کا پٹھا ہے'' ایک ''محاذی'' ٹھیکیدار نے گالی دی۔

''یہ دیانتداری سب ڈھونگ ہے، وہ خوب پیسے بناتا ہے۔'' اس کے ایک ماتحت نے اِنکشاف کیا۔

بڑی متضاد باتیں سننے میں آرہی تھیں میرے ذوق تجسّس نے انگڑائی لی، اور میں عبدالرشید میر کی تلاش میں نکلا۔ تیس بتیس برس کا خوبرو نوجوان جس کے چہرے سے مردانہ وقار کی بجائے نسوائی حیا ٹپک رہی ہے۔ وہ بات کرتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُسے ساری دُنیا کا غم کھائے جا رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ ایک صاف قمیض پہنے ہوئے تھا جس کا کالر بھی بہت صاف تھا، یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں اپنے ہر نئے ملنے والے کی شخصیت کا اندازہ اس کی قمیض کے کالر سے کرتا ہوں۔ اگر اس کا کالر صاف ہے تو میں اس کے متعلق اچھی رائے قائم کر لیتا ہوں اور

اگر خدانخواستہ اس کی قمیض (کوٹ کے کالر سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں) کا کالر میلا ہو تو وہ فوراً میری نظروں سے گر جاتا ہے............ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ عبدالرشید کا ٹیریلین قمیض کا کالر بہت صاف تھا!

عبدالرشید کی شخصیت میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں، جو کسی کو زیادہ دیر تک اپنی طرف متوجہ رکھ سکے۔ اس کی گفتگو کے موضوعات بہت محدود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے نصاب کی کتابوں کے علاوہ بہت کم کتابیں پڑھی ہوں گی۔ اس کی باتوں سے مجھے شُبہ ہوا کہ وہ ہر روز اخبار بھی نہیں پڑھتا (وزیر صحت پیر غیاث الدین بھی نہیں پڑھتے) میں اس کے پاس جب تک بیٹھا رہا، اس نے سگریٹ بھی نہیں پی، جدید مجلسی آداب کی لُغت کے مطابق وہ کسی حد تک بداخلاق ہے اس نے میرا استقبال بڑی سرد مہری سے کیا، اور جب تک میں بیٹھا رہا اس کے چہرے سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ اُسے میرا وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ وہ بہت کم مسکراتا ہے۔ اور جب مسکراتا ہے تو اس کی مسکراہٹ مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے چہرے سے ایک نامعلوم کرب ٹپکتا ہے وہ اپنے متعلق بات کرتے ہوئے یکلخت جذباتی ہو جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کی تلخیوں کو بھولنے کی شعوری کوشش کر رہا ہے میں نے جب بھی اُس سے اس کے ماضی کے بارے میں کوئی سوال کیا، اس نے ٹال دیا۔ ''وہ خبطی ہے'' مجھے اس کے ایک انجینئر دوست کا فیصلہ یاد آیا...... عبدالرشید سے پہلی ملاقات کے بعد مجھے اس کے انجینئر دوست کا فیصلہ زیادہ غلط نظر نہیں آیا۔

عبدالرشید آج کل سرینگر میونسپل کمیٹی میں ایگزیکٹو انجینئر ہے اور شہر کے تمام ٹھیکیدار بلالحاظ مذہب وملت وسیاسی اختلافات عبدالرشید کے خلاف منظّم ہو گئے ہیں۔ عبدالرشید کو گالیاں دی جارہی ہیں۔ اس کے خلاف شکایات کا ایک طوفان کھڑا کیا گیا ہے۔ اُسے نااہل، بددیانت، احمق، پاگل اور خبطی کے القابات سے یاد کیا جارہا ہے۔ اس کی ''بدعنوانیوں'' اور بے ضابطگیوں کے خلاف وزیروں کے پاس وفد جارہے ہیں۔ مسلمان قوم پرست اسے پاکستانی کہہ رہے ہیں اور ہندو قوم پرست اسے فرقہ پرست قرار دے رہے ہیں۔ ٹھیکیداروں کی منظّم قوت نے عبدالرشید کے وجود کو اپنے لئے ایک چیلنج سمجھ رکھا ہے، اور اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے ایک فیصلہ کن جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ اور آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ عبدالرشید کا قصور کیا ہے؟

اس خبطی کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ اس نے ایمانداری اور دیانتداری سے اپنے فرائض نبھانے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ اس نے انجینئر ہونے کے باوجود ایماندار رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے ''سونے کی کان'' میں رہتے ہوئے بھی دیانتدار رہنے کا جرم کیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے غلاظت اور عفونت کے سمندر میں رہتے ہوئے بھی اپنے وجود کو ملوث نہیں کیا ہے۔ وہ بے ایمانی، رشوت خوری اور بدعنوانیوں کے سیلاب کے سامنے چٹان کی طرح ڈٹ گیا ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھی اُسے خبطی، ٹھیکیدار اُسے پاگل اور اس کے ماتحت اسے اپنا دُشمن قرار دیتے ہیں۔ اس کی

سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ کسی کے رعب میں نہیں آتا اس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وزیروں سے خوف نہیں کھاتا۔ کانگریسی ٹھیکیداروں سے مرعوب نہیں ہوتا، اور ''محاذی'' ٹھیکیداروں سے رعایت نہیں برتتا، میں نے شہر کے درجنوں ٹھیکیداروں کو اُسے گالیاں دیتے ہوئے سُنا، لیکن کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ عبدالرشید پر بددیانتی کا الزام لگا سکتا۔ عبدالرشید کے ساتھ کام کرنے والے بھی اس سے خوش نہیں۔ اس کے ''خبطی پن'' نے ان کے لئے بھی مشکلات پیدا کردی ہیں۔ وہ کسی ٹھیکیدار کا دوست نہیں، قواعد وضوابطہ کا غلام ہے۔ اور موجودہ دور میں قواعد وضوابط کی پابندی سے انسانوں کی فس کس آمدنی میں اضافہ ہونا ممکن نہیں۔ عبدالرشید کے دماغ کی کوئی نہ کوئی کل ضرور ڈھیلی ہے۔ ورنہ اس نوجوانی میں اُسے دیانتداری اور ایمانداری کی کیونکر سوجھتی۔ یہ عمر تو کھانے پینے اور کمانے کی ہے۔ اور پھر اس نے اپنے لئے جو پیشہ اختیار کیا ہے۔ اس میں آدمی دیانتدار رہے تو اس کے ذہنی توازن پر شُبہ کرنا فطری بات ہے۔ عبدالرشید ہمارے پورے معاشرے کے لئے ایک خطرہ ہے وہ ہمیں ان قدروں کی یاد دلانا چاہتا ہے۔ جنہیں ہم نے اپنے پاؤں تلے روند کر پامال کر دیا ہے۔ وہ ہمیں وہ سبق یاد دلانا چاہتا ہے جسے ہم نے بھلا دیا ہے۔ وہ اس گھپ اندھیرے میں دیا سلائیاں جلا جلا کر روشنی کرنا چاہتا ہے، اسے معلوم نہیں کہ ہوا اتنی تیز ہے کہ اس کی ماچس کی ایک ایک تیلی جل جائے گی۔ مگر روشنی نہ ہو سکے گی۔ ٹھیکیداروں کے اثر ورسوخ کی آندھی کے سامنے اس چراغ رہگذر کی حقیقت ہی کیا ہے۔ یہ روشنی

جتنی جلد بُجھ جائے اچھا ہے اور ایک اطلاع کے مطابق وزیرِ متعلقہ نے ٹھیکیداروں کے پُر زور اصرار پر اس کے بجھائے جانے کی رسم افتتاح بھی انجام دی ہے۔ سامراجی نظام ہو یا اشتراکی نظام .... ٹھیکیداروں کی عزت اور انکی عظمت بہر حال مقدم ہے۔

طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

کھلی چھٹی

آل احمد سرؔور کے نام

محترم سرؔور صاحب

۲۵/اپریل کو جب کسی نے اطلاع دی کہ یونین ہال کے ہنگامے میں آپ بھی بُری طرح زخمی ہو گئے ہیں تو میر پہلا تاثر افسوس کا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس طوفانِ بدتمیزی میں آپ اتفاقاً کسی پتھر یا لاٹھی کی زد میں آئے ہوں گے۔ ایسے مواقع پر عام طور جو بھگدڑ مچ جاتی ہے، میرا خیال تھا کہ آپ بدقسمتی سے اس بھاگ دوڑ اور دھکم پیل کا شکار ہو کر زخمی ہو گئے ہوں گے۔ لیکن جلد ہی کسی کم بخت نے میری خوش فہمی کا اِزالا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ علی گڈھ کے سرفروشوں اور غیرت مندوں نے علی گڈھ کے شاندار ماضی پر کالک مل دینے کی غرض سے آپ پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ آپ پر پے در پے لاٹھیوں کے وار ہوئے۔ آپ کے طالب علموں نے آپ کا نام لے لے کر آپ پر پتھراؤ کیا۔ آپ کے ہاتھوں کی انگلیاں بُری طرح مجروح ہو گئیں۔ آپ کے ماتھے اور چہرے پر زخم آئے۔

سرور صاحب! خُدا گواہ ہے کہ جب میں نے پہلی مرتبہ یہ خبر سُنی تو

مجھے سُنانے والے کے عقلی توازن پر شُبہ ہونے لگا۔ علی گڈھ کے طالب علم ذلت اور بے مروتی کی ان پستیوں تک جاسکتے ہیں، میرے لئے یہ سوچنا بھی ممکن نہ تھا، سر سید اور محسن الملک کی روایات کے وارث ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی کے علی گڈھ میں پڑھنے والے طالب علم اس بربریت اور حیوانیت کا مظاہرہ کریں گے۔ میرے لئے اس کا تصور بھی گناہ سے کم نہ تھا۔ لیکن جب میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کو بستر پر کراہتے ہوئے دیکھا، جب میں نے آپ کی زبانی تاریخِ علی گڈھ کے اس تاریک ترین لمحے کی حکایت سُنی تو میری رُوح کانپ اُٹھی۔ شرافت، انسانیت، اخلاق اور تہذیب کی ان قدروں پر سے میرا اعتماد متزلزل ہوگیا، جن کو سنوارنے کیلئے آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے، آپ نے جب نحیف سی آواز میں کہا کہ افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ مجھ پر کسی نے ہاتھ اُٹھایا، دُکھ اس بات کا ہے کہ یہ ہاتھ میرے اپنے طالب علم کا تھا۔" تو مجھے ایسے محسوس ہوا کہ آپ کے جسم سے زیادہ آپ کی رُوح گھائل ہے۔ اور سچ پوچھیئے تو اس سانحے کے بعد علی گڈھ تحریک سے وابستہ ہر ذی رُوح انسان کی رُوح گھائل ہوچکی ہے۔ سر سید کی قبر سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر علی گڈھ کے طالب علموں نے اس کے بنائے ہوئے تاج محل کو مسمار کردیا۔ اس کے خوابوں کی دنیا کو لوٹ لیا۔ سر سید پر پتھر پھینکے۔ اسے لاٹھیوں اور بوتلوں سے زخمی کردیا اور اس طرح اس کے احسانات کا بدلہ چکادیا۔ آپ کے جسم کا ایک ایک زخم اور نواب علی یاور جنگ کا ایک ایک گھاؤ سر سید کی قبر کا ناسور بن جائے گا۔

آپ کے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ لیکن بانیٔ علی گڈھ کی رُوح ہمیشہ بے قرار رہے گی۔ آج پہلی بار داورِ محشر کے سامنے سرسید کی نگاہیں شرم اور ندامت سے جُھک گئی ہوں گی۔ ان کے تہذیبی کارناموں کا مدح خوان۔ آل احمد سرورؔ ان کی بنائی ہوئی یونیورسٹی کے طالب علموں کے ہاتھوں زخمی ہو گیا ہے۔ آج مہاتما گاندھی پر کسی ناتھورام گوڈسے نے پھر گولی چلا دی!

سرورؔ صاحب! اسی یونین ہال میں آپ نے اپنی جادو بیانی سے علی گڈھ کا وقار بلند کیا تھا۔ اسی یونین ہال کے کئی تاریخی جلسوں میں صدر یونین کی حیثیت سے آپ نے اجنبیوں پر علی گڈھ کی عظمت کا نقش مرتب کیا تھا۔ یہیں آپ نے اپنے خون جگر سے علی گڈھ کے خاکوں میں رنگ بھرا تھا۔ اور آج اسی احاطے میں آپ پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ ہماری قوم کتنی احسان ناشناس ہے!

سرورؔ صاحب! ۲۵؍اپریل کو علی گڈھ یونیورسٹی کے دامن پر ایک ایسا دھبہ لگ گیا ہے کہ اسے ساری قوم کے آنسو بھی نہیں دھو سکتے۔ آپ نے ہمیں انسانی زندگی کی عظمت کا راز بتایا۔ میرؔ کے مطالعے کی اہمیت سمجھائی، اقبالؔ کے فلسفے کی تہہ تک پہنچنے میں ہماری رہنمائی کی۔ غالبؔ کی فکر اور اس کی اہمیت کا کھوج لگایا۔ آپ نے اپنی عظمت سے علی گڈھ کی عظمت کو بڑھا دیا۔ آپ کے ادبی کارناموں کی وجہ سے علی گڈھ کے وقار میں اضافہ ہوا۔ اور ہم نے پتھروں اور لاٹھیوں سے زخمی کر کے ان احسانات کا بدلہ چکا دیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر سے آپ کا اعتماد بھی اُٹھ جائے۔ کہیں ایسا

نہ ہو کہ شرافت اور مروت کے مسلمات سے آپ کا اعتبار بھی اُٹھ جائے
۔یقین کیجئے کہ آپ پر اٹھنے والا ہاتھ کسی طالب علم کا ہاتھ نہیں تھا، وہ کسی پیشہ
ور غنڈے اور لفنگے کا ہاتھ تھا۔جس نے طالب علم کا بہروپ بھر لیا تھا۔وہ کسی
ننگ انسانیت ،اور ننگ علی گڈھ بدخو کا ہاتھ تھا۔جس نے اپنی ماں سے علی
گڈھ کی عزت و آبرو لوٹنے کے لئے جنم لیا تھا۔ خدا کے لئے ایک چند
پیدائشی جوانوں کی شرانگیزیوں کی بنیاد پر انسان کی بنیادی عظمت پر سے اعتماد

نہ کھو بیٹھئے۔

فقط آپ کا
چراغ بیگ

☆

کھلی چھٹی

۱۹۶۵

اپنے قارئین کے نام

خواتین وحضرات!

''آئینہ'' اپنی زندگی کے پہلے چھ مہینے مکمل کر چکا ہے۔ اخبارات کے لئے چھ ماہ کا عرصہ کامیابی یا ناکامی سے زیادہ نشو ونما، اٹھان اور کردار کی تشکیل کے لئے اہمیت رکھتے ہیں، اور مجھے یہ کہتے ہوئے بے پناہ مسرت کا احساس ہورہا ہے کہ ''آئینہ'' نے اپنی زندگی کے اس مختصر سے وقفے میں ریاست اور بیرون ریاست کے صحافتی حلقوں میں اپنے لئے ایک باوقار مقام بنالیا ہے۔ ریاست کی بنجر زمین میں ایک صاف ستھرا ہفت روزہ نکالنا کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ صرف انہی لوگوں کو ہوسکتا ہے۔ جو اس پیشے سے تعلق رکھتے ہیں یا جنہوں ں ے کبھی یہ جرأت رندانہ کی ہو۔ لکھنے والوں کی بے پناہ قلت، چھپائی کا انتہائی ناقص انتظام، اچھے کاتبوں کا عدم وجود، نہایت بدخط کاتبوں کی بہتات، اخباری کاغذ کی نایابی اور خرید کر اخبار پڑھنے والوں کا فقدان...... یہ اور اسی نوعیت کی حوصلہ شکن مشکلات ہر اخبار نویس کے ارادوں، حوصلوں اور عزائم پر شب خون مارتی رہتی ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان صبر آزما اور مایوس کن حالات میں بھی ''آئینہ'' کی آبرو قائم

رہی۔ اسے ہر مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن چاہنے والوں کی بے پناہ چاہت
نے ہر مشکل آسان کردی۔ بعض بخومیوں نے ''آئینہ'' کے تیور دیکھ کر یہ
پیشین گوئی کی تھی کہ دو چار شماروں کے بعد راہی ملک عدم ہو جائیگا۔ بعض
قیافہ شناسوں نے اسے میری سیمابی فطرت کا ایک اُبال سمجھ کر یہ رائے قائم
کی تھی کہ جلد ہی میرا دل اس ہنگامے سے بھی بھر جائیگا۔ اور ''آئینہ'' کا اجرا
ایک یاد ہو کر رہ جائیگا۔ کچھ سیاسی مولویوں نے یہ فتوئ دیا تھا کہ ''آئینہ'' جس
خود مختار، آزاد اور بیباک پالیسی پر گامزن ہے وہ خود اس کے لئے پیغام موت
ہوگا۔ تجربہ کار اخبار نویسوں نے مشورہ دیا تھا کہ ''آئینہ'' کو زندہ رکھنا چاہتے
ہو تو کسی سیاسی جماعت، گروہ یا شخصیت سے وابستہ ہو جاؤ۔ یہ ساری پیشین
گوئیاں، اندازے اور قیاسات ''آئینہ'' دیکھ کر اپنا سا مُنہ لیکر رہ گئے ہیں۔
''آئینہ'' بڑے عزم و وقار کے ساتھ اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ آپ کی
محبت نے میرے حوصلوں کو بڑھا دیا ہے۔ ''آئینہ'' کے اجراء کے وقت
میرے دل میں جو نامعلوم سے اندیشے اور وسوسے تھے۔ وہ سب غلط ثابت
ہوئے۔ ''آئینہ'' کی مانگ حد سے بڑھتی جا رہی ہے، اتنی کہ اخباری کاغذ کی
نایابی کی وجہ سے ہم آئینہ نوازوں کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔ وادیٔ کشمیر
کا شاید ہی کوئی دور افتادہ علاقہ ہو، جہاں ''آئینہ'' کے خریدار موجود نہ ہوں۔
ہر روز دفتر میں درجنوں ایسے خطوط آتے رہتے ہیں جن میں ہماری کوششوں کو
سراہا جاتا ہے۔ تعریف اور توصیف کے بے لوث اور معصوم جذبات کا اظہار
ہوتا ہے۔ ایک اخبار نویس کے لئے اپنے پڑھنے والوں کے یہ تحفے اور

نذرانے متاع بے بہا کی حیثیت رکھتے ہیں اور یقین کیجئے کہ آپ کی اسی محبت اور خلوص کے سہارے ''آئینہ'' زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ بیرونِ ریاست کے صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں نے بھی ''آئینہ'' کے تئیں ایسے تاثرات کا اظہار کیا ہے، جو کسی اخبار نویس کیلئے سرمایہ ''افتخار ہو سکتے ہیں۔

آج آپ کے نام یہ خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ''آئینہ'' کے متعلق آپ کو چند ایسی باتیں بتاؤں جن کا ''آئینہ'' کے رنگ رُوپ، اس کی ظاہری خوبیوں اور بنیادی خصوصیات سے گہرا تعلق ہے۔ آپ کو اعتماد میں لینے کی وجہ یہ ہے کہ کچھ دوستوں نے شکایت کی ہے کہ ''آئینہ'' کی چمک دمک کبھی کبھی ماند پڑ جاتی ہے۔ اس کے گہرے رنگ کبھی کبھی ہلکے پڑ جاتے ہیں۔ زبان و بیان کے جس انداز نے پڑھنے والوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ وہ کبھی کبھی بے رُوح سا ہو جاتا ہے۔ تلوار میں جو کاٹ پہلے تھی اب نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ دوستوں کی شکایت میں وزن ہے۔ پچھلے دو ماہ سے مجھے خود بھی اس تبدیلی کا حساس ہے۔ مجھے بھی وہ اطمینان حاصل نہیں ہے۔ جو اخبار کی اشاعت کے بعد ایک حساس اخبار نویس کو ہونا چاہیے۔ لیکن میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ رنگوں کا یہ ہلکا پن۔ زبان و بیان کی یہ کمزوریاں، رنگ و روپ کی ناہمواری کا یہ احساس عارضی ہے۔ میں علی گڈھ یونیورسٹی میں ایل ایل بی (فائنل) کا امتحان دے رہا ہوں پچھلے کئی ماہ سے میں سارا پرچہ علی گڈھ میں بیٹھ کر مرتب کرتا ہوں لیکن اب میرے امتحانات چونکہ قریب آ رہے ہیں، اس لئے ''آئینہ'' پر تمام

ر توجہ صرف کرنا ممکن نہیں۔ اسی لئے آپ کو ''آئینہ'' میں زبان و بیان کا ایک نیا اسلوب، ایک نیا انداز اور ایک نیا رکھ رکھاؤ نظر آیا ہوگا۔ ''آئینہ'' کی اشاعت کو باقاعدگی سے قائم رکھنے کیلئے کچھ دوستوں نے اپنا قلمی تعاون پیش کیا ہے، میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ ''آئینہ'' کی ترتیب کا اگرچہ اب بھی میں ہی حصہ دار ہوں لیکن امتحان کی تیاریوں کے پیش نظر میں نے ترتیب وتدوین کا بیشتر کام اپنے ساتھی وید بھسین اور چند دوستوں کے سپرد کر دیا ہے۔ میرے امتحانات اپریل کے آخر تک ختم ہو جائینگے۔ مئی سے ''آئینہ '' کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ پھر میں اسے زبان و بیان، سیاسی، علمی اور ادبی بصیرت کا وہ مرقع بنانے کی کوشش کروں گا کہ ریاست کی صحافتی دنیا ''آئینہ'' کے وجود کو اپنے لئے ایک نیک شگون تصور کر لے۔ آپ کی توقعات، اُمیدوں اور آرزوؤں کا یہ صحیفہ میری تمام تر توجہ کا سزاوار ہوگا جب تک کے لئے آپ کو اسی دعوتِ شیراز پر اکتفا کرنا پڑے گا اور ''آئینہ'' کے اس موجودہ دور کے لئے یہ ضروری ہے کہ مئی ۱۹۶۵ء تک ''آئینہ'' کو زندہ رکھا جائے۔ اور یہ اہم کام میں آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے اس وعدے کو دہراتا ہوں۔ مستقبل قریب میں ''آئینہ'' کی تمام کمزوریوں کی تلافی کر دوں گا۔ آپ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیجئے۔

نیازمند

شمیم احمد شمیم

۵۸۰ کشمیر ہاؤس، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

اصلی مجرم کے نام

پیارے اصلی مجرم!

میں خیرت سے ہوں، اور بارگاہِ انسپکٹر جنرل پولیس سے تمہاری خیریت کا طالب! تم کیا گئے کہ پھر آنے کا نام ہی نہ لیا۔ تمہیں کیسے یقین دِلاؤں کہ تمہاری یاد میں یہاں کا بچہ بچہ سوگوار ہے۔ آج پورے چھ مہینے سے تمہارا نام ہر کشمیری کے وردِ زبان ہے۔ تم شہر اور دیہات میں اتنے مقبول ہو کہ ہر جلسے، ہر جلسوس میں تمہارا نعرہ لگتا ہے۔ جلسہ کسی بھی جماعت کا ہو، نعرہ تمہارے ہی نام کا لگتا ہے۔ ہر جماعت کا یہی مطالبہ ہے کہ تمہیں پیش کیا جائے۔ کیونکہ تمہیں دیکھنے کو اب نظریں ترس گئی ہیں، اپنے ہاں ہر بات میں اختلاف ہے، لیکن تمہارے بارے میں اختلاف نہیں۔ سبھی متوالے ہیں اور تمہیں دیکھنے کی خواہش میں ہر جماعت ایک دوسرے پر سبقت لینا چاہتی ہے۔ تم کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ تم اپنے وطن کیوں نہیں آتے، کشمیر کی سوگوار بہاریں تمہیں یاد کرتی ہیں۔ عوام کی اُداس نظریں تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ تم کتنے ظالم ہو، کچھ تو رحم کرو...... تم سوچتے ہوگے کہ عوام میں تمہاری محبت اور عقیدت کا یہ لاوا کیوں اور کیسے پھوٹ پڑا۔

پیارے! یہ سمجھانے کی باتیں نہیں، سمجھنے کی باتیں ہیں، تم یہاں آؤ گے، تو تم پر یہ حقیقت آشکارا ہوگی، کہ تم نے یہاں کے عوام پر کتنا بڑا احسان کیا ہے، اور وہ تمہارے شکر گذار نہ ہوں گے، تو دنیا میں اُن سے بڑھ کر کوئی ناشکرا نہ ہوگا۔

۲۷ر دسمبر کو تم نے روضۂ حضرت بل سے موئے مقدس کو اپنی جائے پاک سے ہٹا کر ایک مردہ جسم میں جان ڈال دی، تم نے ایک سوئی ہوئی رُوح کو جگا دیا، مضمحل غرور کو جھنجھوڑ دیا، اور قومی غیرت کو للکارا، تم نے موئے مقدس کو اپنی جائے پاک سے کیوں ہٹایا۔ اس سلسلے میں مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ تمہارا راز ہے اور میں یہ جاننے کوشش نہ کروں گا۔ لیکن تمہارا مقصد خواہ کچھ ہی رہا ہو۔ تمہاری اس حرکت نے ایک نئے تاریخی دور کا آغاز کر لیا۔ سترہ سال سے دبی ہوئی، کچلی ہوئی قوم نے ایک کروٹ بدلی، ظلم وستم کے قطب مینار دھڑام سے گر گئے، مطلق العنانی اور شہنشاہی کا سڑا گلا نظام حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا، زبانوں پر تالے لگانے والوں کے گھروں پر تالے پڑ گئے، شریفوں کی عزت پر ڈاکہ ڈالنے والوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں۔ عوام کا خون چوس کر اپنے محلات تعمیر کرنے والے کو اپنے محل ملتے ہوئے نظر آئے۔ وہ جو اپنے آپ کو خالدِ ہند کہلوانے پر لاکھوں روپیہ صرف کرتے تھے۔ رات کی تاریکیوں میں یہاں سے فرار ہو گئے۔ کشمیر آزاد ہو گیا، غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں، زبانوں کے تالے ٹوٹ گئے۔ اور پھر قوم نے اپنے ''محسنِ اعظم'' کی تلاش شروع کی۔ یہ تلاش

اب تک جاری ہے۔

تم نے ''موئے مقدس'' کو ملک صاحب کے سپرد کر کے پورے ملک پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔ اب ایک اور احسان کر ڈالو، کہ اپنے عقیدت مندوں کو ایک جلوہ دکھاؤ، وہ جانتے ہیں، تم کون ہو، یہ بھی جانتے ہیں کہ آج کل کہاں رہتے ہو۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ تمہارے دیدار سے محروم ہیں، معلوم ہوا ہے کہ تم کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں کشمیر چلے آتے ہو۔ اور پھر رات کی سیاہیوں میں واپس چلے جاتے ہو، میں جانتا ہوں کہ اب تم عظمت کی اس منزل پر پہنچ گئے ہو کہ اب تمہیں جلسے، جلوسوں سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ اسی لئے تم عوام سے بھاگتے پھرتے ہو۔ لیکن پچھلے گیارہ سال میں تمہاری شان میں جتنے جلسے ہوئے، سب مصنوعی تھے، تمہارے اعزاز میں جتنے جلوس نکلنے، سب فرضی تھے، ان میں تمہیں اپنی جیب سے پیسہ صرف کرنا پڑتا تھا۔ (یہ الگ بات ہے کہ تم قوم کی جیب کاٹ کر اپنی جیب بھر لیتے تھے) اب کی بار تمہارے اعزاز میں جو بھی جلسہ ہو گا یا جلوس نکلے گا۔ وہ ''اصل'' ہو گا۔ کیونکہ ہر اصل چیز کی اصلی قدر و قیمت مقرر ہے۔ تم نے اصلی مجرم بن کر اپنے لئے ایک خاص اعزاز حاصل کیا ہے۔ اس دور میں جبکہ نہ دودھ اصلی ہوتا ہے اور نہ گھی، تم نے کم از کم اصلی مجرم بن کر اس بات کا ثبوت تو مہیا کر دیا کہ اصلی چیزیں کمیاب تو ہیں، نایاب نہیں ہیں۔

آؤ، اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ قوم تمہاری تلاش میں کتنی بے چین اور بیقرار ہے۔

تمہاری دید ہی مقصد ہے جس کی بصارت کا
وہ چشم منتظر پتھرا گئیں کیا تم نہ آؤ گے

تم بڑے بہادر اور نڈر ہو، تمہاری جوان مردی، دلیری اور سیاسی بصیرت کے قصے تو آج بھی زبانِ زدعام ہیں، باوجود اس کے کہ ہندوستان کی چودہ علاقائی زبانوں سے تمہیں ایک بھی زبان نہ آتی تھی، تمہاری شعلہ بار تقریریں آج بھی ہمارا لہو گرماتی ہیں۔ آؤ میرے بہادر اور جری سیاستدان...... تمہارا شایانِ شان استقبال ہوگا۔ تم آج کل جہاں ہو، سنا ہے وہاں بڑے زوروں کی گرمی پڑ رہی ہے۔ آؤ، اپنے وطن لوٹ آؤ، کہ یہاں کا موسم ان دِنوں بے حد خوشگوار ہے۔

فقط
تمہارا منتظر
چرا بیگ

۱۹۶۴

جن سنگھی سُورماؤں کے نام

پیارے جن سنگھی سورماؤ!

چراغ بیگ وادی کشمیر میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہے۔ تم نہ آتے تو تصویر ادھوری رہتی۔ تم آئے ہو، تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی مصور نے ایک برش پھیر کر تصویر مکمل کر دی ہو۔ مُلک کے گونے گونے میں اپنا جھنڈا گاڑ کر اب تم نے کشمیر کی ''کنواری'' سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ یہاں کے ''فرقہ پرستوں'' کو سیکولرازم کا سبق پڑھانے کے لئے۔ تنگ نظروں کو وسیع النظری کا پیغام دینے کیلئے اور'' بزدلوں'' کو'' بہادر'' بنانے کیلئے۔ کشمیر کی خوشگوار فضائیں تمہیں سلام کہتی ہیں۔ میرے قلم کی بے باکیاں تمہارا خیر مقدم کرتی ہیں۔ میرے شعور کی لغزشیں تمہیں پرنام کرتی ہیں۔ میرے معصوم اندیشے تمیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ تمہاری تشریف آوری نے کچھ خوابیدہ جذبات کو بیدار کیا ہے۔ ان میں سے ایک جذبہ مہمان نوازی کا جذبہ ہے۔ گھر آئے ہوئے مہمان کی دیکھ بھال کرنا ہمارا مقدس فرض ہے۔ کھوراستے میں کہیں

کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی۔ کسی فرقہ پرست نے تمہاری طرف ٹیڑھی نگاہوں سے تو نہیں دیکھا؟ کسی جاہل نے تمہیں فرقہ پرست کہہ کر تمہارے سیکولرزام کی توہین تو نہیں کی۔ کسی کم بخت نے تمہارے ہاتھوں پر لگے ہوئے خون کی طرف اشارہ کر کے تمہاری معصومیت کو معصیت کا احساس تو نہیں دلایا۔ کسی نامراد نے مہاتما گاندھی اور جواہرلال نہرو کی تصویر کی نمائش کر کے تمہارے ذوق جمال پر طنز تو نہیں کیا؟ کسی بے وقوف نے تمہارے خلوص اور تمہاری نیتوں پر شک کر کے تم کو تمہارا شاندار ماضی یاد دلانے کی حماقت تو نہیں کی؟ کہو، بے تکلف ہو کر، اپنا گھر سمجھ کر سب کچھ کہہ دو یہ کشمیر ہے۔ اور میرے کشمیر کا ذرّہ ذرّہ مہمان نواز ہے۔ تم یہاں کیا بیچنے آئے ہو۔ ہم بخوبی جانتے ہیں۔ تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے۔ اسے ہم بخوبی واقف ہیں۔ تمہارے ارادے اور عزائم کیا ہیں، یہ ہم سے پوشیدہ نہیں۔ تمہاری تاریخ، جغرافیہ اور حدود اربعہ کیا ہے یہ ہمیں زبانی یاد ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جو زہر لے کر تم اس وادی گُل پوش میں آئے ہو یہاں اس کی تاثیر زائل ہو جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو بیج لے کر تم یہاں وارد ہوئے ہو وہ اس آب و ہوا میں نمو نہیں پاتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ جن مقاصد کی آبیاری کے لئے تم نے اس کٹھن سفر کی زحمت اُٹھائی ہے۔ وہ مقاصد یہاں کے درجہ حرارت میں پنپ نہیں سکتے۔ اس مٹی کی تاثیر ہی کچھ اور ہے۔ یہاں ہندو، مسلمان اور سکھ گذشتہ کئی صدیوں سے بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ یہاں مسلمان، مسلمان سے لڑتا ہے (معرکہ فاروق

عبداللہ) ہندو، ہندو سے لڑتا ہے ۔ (معرکہ پشن وشیونرائن) لیکن یہاں کا مسلمان ہندو سے نہیں لڑتا ......، یہ عجیب وغریب ستم ظریفی ہے ۔ لیکن تم لوگ اس کا کر بھی کیا سکتے یہ تو صدیوں پرانی بیماری ہے ۔ تمہارے ایجاد کردہ نسخے اس بیماری کا علاج نہیں کر سکتے ۔

''یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمہاری جماعت فرقہ پرست جماعت نہیں ہے...... '' کیوں کیا فرقہ پرستی کی تعریف بدل گئی ہے؟ اپنے ہاں تو ابھی وہی پُرانی تعریف ہی چل رہی ہے ۔ جس کی رو سے تم فرقہ پرستی کے بادشاہ قرار دئے گئے ہو ۔ نئی ڈکشنری کی کچھ کاپیاں یہاں بھی بھیج دیجئے تا کہ یہاں کے جاہل عوام کو بھی الفاظ کے نئے معنی سمجھنے میں مدد ملے ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے کھوٹا مال بیچنے کے لئے لیبل بدل دیا ہو ۔ اپنے ہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ کٹھی دہی بیچنے والا تازہ، عمدہ مزیدار دہی ملاوٹ کا تیل بیچنے والا خالص سرسوں کا تیل اور رولڈ گولڈ کے زیوارت بیچنے والا، اصلی سونے کے زیورات کی آوازیں لگاتا ہے ۔ کہیں تم نے اپنی کھٹائی اور ملاوٹ کو چھپانے کے لئے اپنا سائن بورڈ تو نہیں بدل ڈالا ہے ۔ سائن بورڈ بدلنے سے دہی کی کھٹائی اور تیل کی ملاوٹ نہیں جاتی ۔ اس کے لئے دہی اور تیل بدلنا پڑتا ہے ۔ تم کو بھی اگر اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ فرقہ پرستی ذلت، رسوائی اور پشیمانی کے سوا کچھ نہیں تو تم اپنا سائن بورڈ بدلنے کے بجائے اپنے آپ کو بدل دو کشمیر بڑی عجیب وغریب جگہ ہے ۔ یہاں کے لوگوں نے اس وقت فرقہ پرستی کو قبول نہیں کیا، جب فرقہ پرستی اپنے پورے شباب پر تھی ۔ جب

اس کا جلوۂ صدرنگ ، غارت گرِ ہوش و تمکین تھا۔ آج جب فرقہ پرستی کے چہرے پر جھریاں اوراس کے دامن پر ہزاروں خون کے دھبے ہیں۔ کشمیری عوام اس کلنک کواپنے ماتھے پر لگانے کے لئے کیونکر تیار ہوسکتے ہیں؟

سورماؤ! تمہاری تلوار کی دھار بہت تیز ہے۔ تم نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ بعض لوگ تم پر مہاتما گاندھی کے قتل کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ تم نے بھارت کو رام راجیہ کا ایک مثالی پیکر بنانے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ ہم تمہاری لگن، تمہارے ایثار کے قائل ہیں لیکن یہ نہیں بھولو کہ جس سرزمین پر تم نے قدم رکھا ہے اس پر تم سے قبل مہاتما گاندھی اور جواہر لال کے قدم بھی پڑے ہیں ان کے قدموں کے نشان ایک مقدس امانت ہیں۔ اس امانت کی حفاظت ہمارا دھرم اور ہمارا ایمان ہے۔ کشمیر کی سرزمین تمہارے خوابوں کی سرزمین نہیں۔ یہاں تمہارے خواب ٹوٹ جائینگے۔ لوٹ کر چلے جاؤ۔ اس دھرتی کو شیخ نورالدین کے قدم چھو گئے ہیں۔ یہ حبہ خاتون اور مہجور کی سرزمین ہے۔

فقط

تمہارا

چراغ بیگ

مفت خورے کے نام

پیارے مفت خورے!

مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ تم میرا یہ خط بھی مفت ہی میں پڑھ جاؤ گے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خط پڑھتے ہوئے تم کس عالم میں ہو گے! ہو سکتا ہے کہ تم بس میں اپنے ساتھ بیٹھ ہوئے مسافر کے پرچے کو جھانکتے ہوئے سارا پرچہ پڑھ ڈالنے کی کوشش میں ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی نیوز ایجنٹ کی دکان پر کھڑے کھڑے اپنی من پسند چیزیں پڑھ رہے ہو۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ تم اپنے کسی دوست کے بچے کی عیادت کے بہانے سے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے اس کے اخبار کو چاٹ رہے ہو۔ عجب نہیں کہ تم کسی ریستوران میں بیٹھے چائے کی چُسکیاں بھرتے ہوئے ہوٹل والوں کا اخبار بھی پی رہے ہو۔ اگر تم بُرا نہ مان جاؤ تو تم سے یہ بھی بعید نہیں کہ تم کسی ریڈنگ روم، ہوٹل یا دفتر سے اخبار اُڑا کر لائے ہو اور اب اپنے گرم گرم بستر میں میری محنت کے مزے لے رہے ہو، کیونکہ ان جگہوں پر اکثر اخبار کھو جانے کی شکایت عام ہے اور بیس پیسے کا اخبار تمہارے سوا اور چرائے گا بھی کون؟

پیارے! تمہیں اخبار بینی کا اتنا شوق ہے یہ ہم سب کیلئے بہت بڑی خوشی کی بات ہے ہم تو چاہتے ہیں کہ ملک کا بچہ بچہ اسی طرح اخبار بینی کے عشق میں مبتلا ہو۔ ہماری حکومت نے پچھلے کئی برسوں میں تعلیم پر لاکھوں روپے اس لئے صرف کئے کہ ملک کے نونہال اخبار پڑھنے کے اہل ہو جائیں اور ان لاکھوں روپے کے صرفے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ پہلے اخبار پڑھتے تھے انہوں نے اخبار پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ کیونکہ اخبارات میں صرف پنج سالہ پلان کے اشتہار چھپتے تھے۔ بہر کیف، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہارا اخبار بینی کا شغل بہت خوب ہے یہ ملک اور قوم کے لئے بہت ہی خوشگوار اور خوش کُن شگون ہے۔ لیکن تم بُرا نہ مانو تو تم سے دو ایک باتیں کرلوں۔ بُرا ماننے کی کوئی بات ہی نہیں۔ کیونکہ تم نے یہ خط پڑھنے کے لئے کون سے پیسے خرچ کئے ہیں۔ مفت میں دو ایک باتیں ہی سُن جاؤ۔

تم جانتے ہو کہ ہر چیز کی پیدائش میں روپے لگتا ہے، خود تمہاری پیدائش میں بھی کافی روپے صرف ہوا ہے۔ تمہارے ماں باپ کی شادی پر تمہارے دادا، نانا کا خاصا روپیہ صرف ہوا تھا۔ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا لیکن یہ کہہ دیتا ہوں کہ تم مفت پیدا نہیں ہوئے۔ تمہاری تعلیم تمہارے والدین کی کوششوں کے باوجود مفت نہ ہو سکی۔ تم جس دفتر میں نوکر لگے ہو وہاں بھی ''مفت'' نہیں لگے ہو۔ ابا میاں زندہ ہوں تو اُن سے پوچھ لینا کہ نوکری حاصل کرنے کیلئے کیا قیمت دینا پڑی تھی۔ اخبار کی پیدائش میں بھی کچھ محنت، کچھ کاغذ، کچھ سیاہی ...... غرض کچھ روپے لگتا ہے۔ تم جو بس میں

بیٹھے ہوئے، نیوز ایجنٹ کی دُکان پر کھڑے، دوست کے ڈرائنگ روم میں، ہوٹل میں چائے پیتے...... سارا اخبار چاٹ کر جاتے ہو، تمہیں کبھی اس بات کا احساس ہوا ہے کہ تم کسی کی محنت اور عرق ریزی کو اس کی قیمت دیئے بغیر اپنے تصرف میں لا رہے ہو، تمہارے کان میں کھجلی ہوتی ہے تو تم اڑھائی روپے کا پنسلین صرف کر کے اپنے کان کی کھجلی دور کرتے ہو، تمہاری آنکھ میں کوئی خلش ہوتی ہے تم گیارہ روپے صرف کر کے ڈاکٹر سے معائینہ کرواتے ہو، تمہارے بچے کو قبض کی شکایت ہوتی ہے تو تم اس کے وجود سے فُضلہ خارج کرانے پر دس بارہ روپے خرچ کر ڈالتے ہو۔ لیکن اپنے ذہن کی کھجلی، اپنے دل کی خلش اور اپنے شعور کا قبض دور کرنے کیلئے تم ۲۰/ پیسے (آئینہ...... قیمت ۲۰/ پیسے فی کاپی) خرچ کرنے کے روادار نہیں۔ تف ہے تجھ پر مفت خورے! مفت خورے! اگر تو نے مفت اخبار پڑھنا نہ چھوڑ دیا تو تمہارا یہ اخبار جسے مفت پڑھنے کے لئے تم ایک جمعرات سے لے کر دوسری جمعرات تک بے چین اور بے قرار نظر آتے ہو، بند ہو جائے گا۔ پھر تمہیں یہ اخبار نہ بس میں پڑھنے کو ملے گا اور نہ کسی نیوز ایجنٹ کی دُکان پر۔ تمہیں پھر پنج سالہ پلان کے اشتہارات پڑھنا پڑیں گے۔ پھر اپنے ذوقِ اخبار بینی کی تسکین کے لئے قصائی کی دکان سے آئے ہوئے گوشت آلودہ اخبارات کے ٹکڑے پڑھنا پڑیں گے۔ پھر نہ تمہارے ذہن میں کھجلی ہو گی اور نہ دل میں خلش۔ تم بھی میرے اس اخبار کے ساتھ ہی مر جاؤ گے۔ تم خود زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے اخبار کو زندہ رکھو اور اخبار کو زندہ رکھنے کے لئے

صرف ۲۰ ر پیسے کی ضرورت ہے۔ اگر اس دنیا کی فکر نہیں ہے تو خدا کے لئے اپنی عاقبت کی فکر کرو روز جزا تمہاری ہر خطا معاف کی جا سکتی ہے۔ پروردگار بڑا رحیم و کریم ہے لیکن میری اطلاع کے مطابق وہ اپنی رحیمی اور کریمی کے باوجود اپنے بندوں کی ایک خطا کبھی معاف نہ کرے گا۔ اور وہ ہے دوسروں کی محنت کا استحصال ...... اپنے دل کو ٹٹول کر بتا کہ آج کتنے دنوں سے تو میرا یہ اخبار مفت پڑھ رہا ہے۔ کتنے دنوں سے میری محنت کا استحصال کر رہا ہے۔ میرے پیارے استحصالی عنصر! اب نئے سماج میں تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تمہیں ختم کرنے کے لئے ایک عالمگیر تحریک چل رہی ہے اگر تم نے مفت اخبار پڑھنے کا اپنا وطیرہ نہ بدلا۔ تو بقول شاعر ؎

تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی، داستانوں میں!

ہاں ایک اور بات بھی بتائے دیتا ہوں، نیوز ایجنٹوں، ہوٹل والوں اور تمہارے دوستوں کو بھی پتہ چل چکا ہے کہ تم مفت خورے ہو، تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے آتے ہی نیوز ایجنٹ اخبار سمیٹنے لگتا ہے۔ ہوٹل والا تمہیں دیکھتے ہی اخبار اُٹھا کر خود پڑھنے لگتا ہے۔ تمہارے دوست کا پیمانہ صبر ابھی تک لبریز نہیں ہوا ہے لیکن ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے۔ عجب نہیں کہ کسی دن تم ریڈنگ روم سے اخبار چُرانے کے الزام میں پکڑے جاؤ گے۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں پکڑے جانے کی خبر اخبار میں مفت چھاپوں گا۔

فقط

تمہارا چراغ بیگ

کھلی چھٹی

١٩٧٠

راج کپور کے نام

پیارے راج!

تم مجھے نہیں جانتے ہو، لیکن میں تمہیں اچھی طرح سے جانتا ہوں ۔مجھے تمہاری تاریخ پیدائش، تمہارے بچپن کی شرارتوں اور تمہاری جوانی کے کارناموں کی طویل فہرست زبانی یاد ہے۔تمہارے والد محترم اور تمہارے برادران عزیز کی سوانح حیات کا ایک ایک ورق میرے ذہن میں محفوظ ہے۔تمہارے بارے میں شائع شدہ ہر چیز، تمہاری اداؤں اور شوخیوں کے قصے، تمہاری محبت کے افسانے اور تمہاری دلنواز شخصیت کا ہر پہلو میری نگاہوں کے سامنے ہے۔تمہارا بنایا ہوا ہر فلم بڑی باقاعدگی سے دیکھتا ہوں، برسات، آگ، آوارہ، جاگتے ہو، جس دیش میں گنگا بہتی ہے اور سنگم...... یہ سب فلمیں میں نے دیکھی ہیں۔اس کے علاوہ وہ فلمیں بھی جو تم نے نہیں بنائی ہیں۔لیکن جن میں تم نے کام کیا ہے تم میرے پسندیدہ ہیرو ہو، تمہاری ہر ادا پر میں نے جان دی ہے۔تم اگر آج سے صرف پندرہ دن پہلے میرے گھر آتے، تو اپنی درجنوں تصویروں سے میرے گھر کے در و دیوار مزین پاتے۔میں نے تم سے، تمہارے فن سے، تمہاری مسکراہٹوں اور تمہارے آنسوؤں سے پیار کیا ہے۔قرض لے لے کر تمہاری فلمیں دیکھی ہیں۔ابھی

پچھلے ہی دنوں میں نے اپنے ایک دوست سے ساڑھے تین روپے قرض لے کر تمہارا تازہ ''شاہکار'' سنگم دیکھا۔ میرے دل میں تمہاری عزت اور تمہاری محبت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ سنگم دیکھ کر میں تمہاری عظمت سے زیادہ تمہاری ذہانت کا قائل ہو گیا۔ تُم بڑے ذہین ہو۔ ہماری نبض پہچانتے ہو۔ ہماری کمزوریوں سے واقف ہو۔ ہمارے دل کی ہر دھڑکن کو سنتے ہو......لیکن آج تمہارے نام یہ کھلی چھٹی اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ تمہاری ذہانت اور تمہاری فن کاری کی داد دوں۔ بلکہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ تم پر یہ واضح کردوں کہ تم کیا ہو! تمہاری حقیقت کیا ہے۔ اور تمہارے فن کی اصلیت کیا ہے؟

راج! ایک خوشگوار سی صبح تھی، رات کو پانی برسا تھا۔ خشک سی ہوا چل رہی تھی۔ میں اپنے باغیچے میں بیٹھا اپنی زندگی کے کچھ حسین لمحوں کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہاکر نے اخبار لاکر دیا۔ پہلے ہی صفحے پر بڑی منحوس خبر تھی۔ تمہارے مکان اور سٹوڈیو کی تلاشی لی گئی تھی مجھے ایسا لگا کہ جیسے پولیس میرے گھر کی تلاشی لے رہی ہو۔ فلم آوارہ کا ہیرو، جس دیش میں گنگا بہتی ہے کا مرکزی کردار، سنگم کا خالق پولیس کے نرغے میں آجائے گا۔ یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ اور پھر تمہارے گھر کی تلاشی لی گئی تمہارے لاکر توڑے گئے۔ لاکھوں روپے کا ناجائز روپیہ، سونا اور بیرونی کرنسی ضبط کی گئی۔ اس طرح مالا سنہا وجینتی مالا اور دیگر صف اول کے اداکاروں کے گھروں سے کالا روپیہ برآمد کیا گیا۔ ان کے لاکر توڑ کر ان

کی ریا کاری، فریب اور مکر وریا کا پردہ چاک کر دیا گیا۔ پردۂ سیمین پر شرافت اور بلند اخلاقی کا درس دینے والوں کے چہروں سے ملمع اُتر گیا۔ میں نے اپنے کمرے سے تمہاری وجینتی مالا اور مالا سنہا کی فریم شدہ تصویریں اُتار کر چکنا چور کر دیں۔ مجھے تمہارے وجود سے نفرت ہوگئی تمہارا فن مجھے ایک دھوکہ اور تمہاری اداکاری، عیاری نظر آنے لگی۔ تم ہماری محرومیوں اور مجبوریوں کو بیچ بیچ کر لاکھوں روپیہ کماتے ہو۔ تم ہمارے خوابوں کو چُرا کر اپنے لئے عالیشان محل تعمیر کرتے ہو۔ تم ہماری محبت اور ہمارے جذبات کا سہارا لے کر اپنے لئے ایک محفوظ دنیا آباد کر لیتے ہو۔ تم ہمارے زخموں کو کرید کرید کر اس خلش کی تجارت کرتے ہو۔ جو ہمیں بے چین کر دیتی ہے۔ تم ہماری زندگی کی ٹیسوں کو فن بنا کر اپنے لئے دھن پیدا کرتے ہو۔ تم ہمارے افلاس اور ہماری عفونت کو فلم بند کر کے امریکہ، روس، جرمنی اور فرانس میں عیاشی کرتے ہو۔ پردۂ سیمیں پر ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر دکھا دکھا کر ہماری جیبیں صاف کر دیتے ہو۔ اور ہم تمہاری اداؤں پر جان دے دے کر تمہارے خزانے بھر دیتے ہیں۔ تم ہنستے ہو تو ہم تمہارے ساتھ ہنستے ہیں تمہاری آنکھوں میں مصنوعی آنسو ٹپکتے ہیں تو ہماری آنکھیں اصلی آنسوؤں سے نم ہوتی ہیں۔ تم نے ہماری محبت اور عقیدت پر اپنی شہرت اور عظمت کے محل تعمیر کئے ہیں۔ اور ہم نے تمہیں اپنی بھر پور محبت سے مالا مال کر دیا......

لیکن تمہارے لالچ اور حرص کی کوئی انتہا نہیں۔ تم نے قانون کو دھوکا دے کر، اخلاق اور شرافت کے ضابطوں کو پامال کر کے ہماری محبت اور ہمارے خلوص

کا مذاق اُڑا کر لاکھوں روپیہ دیواروں میں چھپا دیا...... انکم ٹیکس سے بچنے کیلئے تم نے وہی کیا، جو کوئی چور، اُچکا یا دغا باز کرتا ہے۔ اپنے لاکروں میں چھپا ہوا روپیہ میرا روپیہ ہے۔ یہ ہندوستانی روپیہ ہے۔ یہ روپیہ تم نے ہماری جیبیں کاٹ کاٹ کر جمع کیا ہے۔ مشہور اخبار نویس درگا داس کا کہنا ہے کہ روسیوں کو صرف دو ہندستانی نام یاد ہیں ایک جواہر لعل نہرو کا اور دوسرا تمہارا! جب روس والوں کو پتہ چل گیا ہوگا کہ تم چور ہو، تم کالا روپیہ چھپا کر رکھتے ہو انکم ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ تم ناجائز طور پر غیر ملکی کرنسی رکھنے کے بھی مجرم ہو۔ تو ان لوگوں نے ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی...... تم نے جواہر لال نہرو کے ساتھ تصویریں کھچا کھچا کر اپنی شہرت اور عزت میں بھی اضافہ کیا ہے۔ آج جواہر لعل نہرو کی رُوح تم سے پوچھتی ہے۔ تمہاری وجنتیی مالاؤں اور مالا سنہاؤں سے پوچھتی ہے کہ بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ تم نے ملک کو ملک کے قانون کو، ہزاروں لوگوں کی محبت اور لاکھوں عوام کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ فلموں میں اپنے جسموں کی نمائش کر کے ہمارے جنسی جذبات کو برانگیخت کرنے والی وجنتیی مالاؤ...... تم فن کی دیویاں ہو، یا دھن کی ......؟ غریبوں اور مفلسوں کا بہروپ بھر بھر کر ہماری جیبیں کاٹنے والے راج کپور! ہندوستان کی غریب جنتا تمہیں کبھی معاف نہیں کرسکتی۔

فقط

تمہارا

عبدالقادر دیوان (مرحوم)

یہ کیسی سرگوشئ ازل سازِ دل کے پردے ہلا رہی ہے
مرِی سماعت کھنک رہی ہے کہ تیری آواز آ رہی ہے

زندگی کا آبگینہ بے حد نازک ہے۔ اس کا مجھے ہمیشہ احساس رہا ہے۔ موت کتنی بے رحم اور بے مروت ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے عبدالقادر دیوان کی انتہائی غیر متوقع اور المناک موت ہی سے ہوا۔ میں کسی جذباتی ہیجان یا ذہنی طلاطم میں مبتلا ہوئے بغیر اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ کہ دیوان صاحب کی موت نے زندگی کو میرے لئے اس درجہ بے اعتبار بنا دیا ہے کہ اب اس پر میرا اعتبار بحال ہونا مشکل ہے۔ اس کی موت پر آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا ہوں۔ اس کی خوبیاں گناتے گناتے اسے بھول سکتا ہوں۔ لیکن اس کی موت نے زندگی کی ناپائداری اور دنیا کی بے اعتباری کا جو سبق دیا ہے اسے کیونکر بھلا دوں؟

دیوان کے بارے میں کہنے اور لکھنے کے لئے میرے پاس اتنی باتیں ہیں کہ ایک پوری کتاب لکھنے کے بعد بھی یہ محسوس ہوگا کہ ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ لوگ جو دیوان کو نہیں جانتے اور میری زبان

سے پہلی بار ان کا نام سُن رہے ہیں۔ ان کو میری باتوں سے کیا دلچسپی ہوگی!
دیوان کوئی سیاسی لیڈر نہیں، کوئی سماجی مصلح، کوئی بہت بڑے شاعر یا ادیب
نہیں تھے کہ ان کے عظیم الشان کارناموں کی یاد دلا کر ان کی بے وقت موت
کا ماتم کروں۔ وہ ایک اچھے تاجر تھے، ایک اچھے انسان تھے اور ایک اچھے
دوست...... لیکن دنیا اچھے انسانوں کا نہیں، بڑے انسانوں کا ماتم کرتی ہے۔
اس لئے دیوان کی موت کا غم بلاشرکتِ غیرے میرا غم ہے۔ اور میں خوش
قسمت ہوں۔ کہ اس غم میں میرا کوئی شریک نہیں!

عبدالقادر دیوان ان معنوں میں اچھے آدمی نہیں تھے، کہ وہ دیانتدار
تھے، پابند صوم وصلوٰۃ تھے، کسی کا دل نہ دُکھاتے تھے یا محتاجوں کو کھانا کھلاتے
تھے۔ ایسے آدمی دنیا میں کمیاب ضرور ہیں۔ لیکن نایاب نہیں۔ عبدالقادر
پیدائشی مسلمان تھے۔ اسلام سے انہیں والہانہ عشق تھا، لیکن وہ زاہد خشک نہ
تھے۔ رِند پاکباز تھے، یہ ان کی سب سے بڑی خوبی اور قابل ذکر خصوصیت
تھی۔ وہ جس ماحول میں پلے بڑھے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ صرف ایک کا
میاب تاجر ہو کر رہ جاتے، لیکن یہ ان کی رندانہ طبیعت کا اعجاز تھا کہ وہ
کامیاب تاجر ہونے کے باوجود ایک اچھے انسان بھی تھے۔ دلی کی میوہ
منڈی میں بھی وہ غالبؔ، مومنؔ اور اقبالؔ کی تلاوت کر کے اپنے ذوق کو
آسودہ کرتے رہے۔ اور دکانداری کے غیر شاعرانہ ماحول میں بھی اپنی روح
کو آلودگیوں سے بچاتے رہے۔ ان کے جسم پر اکثر کاروباری دنیا کا گرد
وغبار جما ہوا نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی روح اِن آلائشوں سے پاک اور منزہ تھی

اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے راستے جُدا جُدا ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ اس قربت اور ذہنی وابستگی کی بہت سی وجوہات تھیں، لیکن سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ میں دیوان کو اپنا دوست ہی نہیں اپنا مربی اور رہنما بھی سمجھتا تھا۔ دیوان میری زندگی میں نہ آتے تو میری زندگی کا دھارا نہ معلوم کون سا رُخ اختیار کرتا۔ والد مرحوم کی وفات کے بعد جب زندگی میرے لئے موت سے بھی زیادہ خوفناک تھی اور میں ابنائے زمانہ کی سرد مہری کی تاب نہ لاکر اپنے لئے فرار کی راہ تلاش کر رہا تھا عبدالقادر دیوان نے مجھے سہارا دیا، حوصلہ دیا اور اعتماد بخشا۔

۱۶ ربرس پہلے کا واقعہ ہے میں زندگی کے پُر خار سفر کی پہلی ہی منزل پر تھک کر بیٹھنے والا تھا، کسی دوست یا عزیز نے پولیس میں نوکری کا مشورہ دیا۔ میں نے دیوان کو لکھا کہ اس کی کیا رائے ہے؟ اس نے لکھا

''رہی پولیس کی سب انسپکٹری، آپ نے کہا ہے کہ شمیم بن کر فیصلہ کرو، کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، بھیا! آپ کی مجبوریاں جانتا ہوں، ذمہ داریوں کو سمجھتا ہوں۔ والد صاحب کی بے وقت موت بھی پیش نظر ہے اور پھر موجودہ کساد بازاری کا عالم جس کا خاتمہ حدِ نظر سے اوجھل ہے۔ فارغ التحصیل اصحاب کی در در کی ٹھوکریں اور اس اندھیر گردی میں یہ پوسٹ اور معقول تنخواہ، بھئی کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ یہ مسئلہ میرے لئے بھی ایک ایسی ہی اُلجھن بن کر رہ گیا ہے، جیسے آپ کے لئے اور پھر آپ اور آپ کی علمی تشنگی ...... نہیں بھیا! ایسا نہ کیجئے۔ اگر آپ نے تعلیم چھوڑ دی تو مر جائیں گے

آپ کے دلولے، خون ہوگا آپ کی آرزوں کا، حسرتوں میں بدل جائینگے آپ کے ارمان، آپ کا سینہ قبرستان بنے گا تمام اُمیدوں اور خواہشوں کا۔ آپ کی زندگی بے کیف ہوکر رہ جائے گی، پھر کہیں بھی نہ پاسکیں گے آپ مسرتوں کو! اور پھر پولیس کی نوکری......ایک آہنی دیوار کھڑی ہے۔ علم وادب اور اس ماحول کے درمیان! یہاں تو علم کی کرن بھی نہ پہنچے گی آپ کے پاس اور پھر تعلیم چھوڑنے کے بعد اس دیوی کو منانا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس کا مجھے تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ گو مصائب اور مجبوریاں آپ کو گھیرے ہوئے ہیں آپ کے فرائض آپ کو بُلا رہے ہیں۔ کارزار حیات میں آپ کی جگہ خالی ہے لیکن یہاں آکر آپ کا سکون گم ہوجائے گا فی الحال اس آواز سے اپنے کانوں کو بند کیجئے۔ مصائب کا بہت سا زمانہ گذر چکا ہے جو باقی ہے بیت جائے گا۔ تعلیم کو جاری رکھو۔ میرا دل مجھ سے کہہ رہا ہے کہ آپ کا فلاح و بہبود صرف حصول تعلیم میں مضمر ہے۔''

اور یہ خالی خولی نصیحت نہیں تھی، محض ایک بے لوث مشورہ نہیں تھا۔ اس کے آخر میں ایک پر خلوص پیشکش بھی تھی''

''باقی رہا سوال پیسے کا، اس کی ضرورت آپ کو دو سال بعد ہوگی، میں آپ سے جو کہہ چکا ہوں کہ اگر زمانے نے آنکھیں نہ پھیر لیں تو اس وقت مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا۔ کروں گا۔''

اور یہ وہ دیوان کہہ رہا تھا۔ جسے صرف میٹرک تک اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے زہر کے گھونٹ پینا پڑے۔ جس کی ساری تمنائیں، ساری

آرزوئیں اور سارے دلولے جوان ہونے سے پہلے ہی دم توڑنے پر مجبور ہو گئے جس نے کالج میں داخلہ لینے کے لئے اپنے ہی ایک عزیز کا خانساماں بننے کی بھی پیشکش کی تھی۔ یہ دردناک داستان دیوان کی ہی زبانی سن لیجئے۔

"......کو کالج بھیجنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ کئی سوٹ بن کر آ گئے۔ نیا بستر بن کر آ گیا۔ سرینگر میں مکان کا ایک طبقہ کرایہ پر لیا گیا۔ اور ساتھ بھیج دینے کے لئے باورچی کی تلاش شروع ہوئی میں جانتا تھا کہ میرے لئے اب آگے بڑھنا ناممکنات میں سے ہے۔ میٹرک سے آگے تعلیم جاری رکھنا کارے دارد والا معاملہ تھا۔ پھر بھی ایک دفعہ کوشش کرنا چاہتا تھا اور اس کوشش کا طریقہ سوچتے سوچتے رات کو مجھے دیر تک نیند نہ آئی تھی......والدہ صاحبہ کی عادت صبح سویرے اُٹھنے کی تھی وہ نماز پڑھنے کے بعد خواجہ صاحب کو منہ دھونے کے لئے گرم پانی دیا کرتی تھیں۔ آج خواجہ صاحب ذرا سویرے اُٹھے، والدہ صاحبہ بھی نماز سے فارغ ہوئیں تھیں، انہوں نے پانی بھیج دینے کے لئے ان کو پکارا۔ ان کی آواز نے مجھے جگایا۔ جلدی سے اُٹھ کر چولہے سے گرم پانی لا کر انہیں دیا۔ انہیں منہ دھوتا چھوڑ کر ان کے کمرے میں گیا۔ ان کا بستر اُٹھا کر جائے نماز بچھا کر رکھ دی۔ اس کے بعد خود ہاتھ منہ دھو کر نماز پڑھی۔ وہ تنہا تلاوت قرآن کر رہے تھے۔

میں نے حقے کا پانی تازہ کیا۔ تلاوت ختم ہوئی میں نے انہیں حقہ پلایا۔ جی ہاں میں نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ آج میں اپنی عزیز ترین آرزو کو ان کے سامنے رکھنا چاہتا تھا اور ایسا کرنے سے پیشتر ان کے دل میں

ہمدردی اور شفقت کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے میں خدمت اور سعادت مندی کا سہارا لے رہا تھا۔

..........اس کے بعد معمول کے مطابق جو آدمی چائے لانے کے لئے مامور تھا اُسے موقعہ نہ دے میں چائے لیکر حاضر ہوا۔ انہوں نے نوش فرمائی۔ حقہ پلانے کے بعد مربیانہ لہجہ میں ارشاد ہوا دری اور نمدہ لے جا کر باغ میں بچھاؤ۔ نو بج گئے ہیں۔ وہاں بیٹھیں گے۔ فوراً تعمیل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ صاحب وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ میں ان کے سامنے بیٹھا تھا اور اپنے مقصد کو ان کے حضور میں پیش کرنے کیلئے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ دفعتاً انہوں نے خود ہی دریافت کیا۔

''تمہارے خیال میں..........کو کھانا پکانے کیلئے کون سا نفر ساتھ بھیج دینا موزوں رہے گا۔'' میں نے موقع غنیمت سمجھا، دل کو جوان کے جلال سے ہر وقت بلاوجہ کانپتا رہتا تھا۔ مضبوط کر کے عرض کی جو انتخاب پیش کروں گا کیا آپ اسے قبول فرمائینگے۔ ''ضرور، ضرور بتاؤ تو سہی'' ''یہ شرف مجھے بخش دیجئے'' میں نے سراپا التجا بن کر عرض کیا۔ ''کیا مطلب'' عتاب اور ناراضگی سے بھرپور لہجے میں استفسار ہوا حوصلے ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے، دلِ کانپ رہا تھا، لیکن اپنے مفہوم کو وضاحت طلب سمجھ کر اور اپنی ساری جرأت کو خرچ کر کے بولا، میں اُن کے لئے کھانا پکاؤں گا۔ کسی نفر کی ضرورت نہ ہوگی اور خود بھی پڑھوں گا۔ وہ انتہائی غیظ میں آ گئے اور غضبناک ہو کر بولے ''لعنت تمہاری پڑھائی پر، میں تمہیں اپنے ساتھ دکان پر بٹھانے

کا شرف دے رہا ہوں اور تم باورچی بننے کے ذلیل خواب دیکھ رہے ہو" یہ ایک زہر میں بجھا ہوا تیر تھا جو میرے سینے کے اندر پیوست ہو گیا۔ یہ بیدردی اور بے حسی کی انتہا تھی۔ میری آنکھیں ڈبڈبائیں۔ میرے لئے وہاں کھڑا رہنا بھی دشوار ہو گیا۔ میں اپنے آنسو انہیں دکھا کر اب ذلیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سیدھا گھر آیا۔ والدہ صاحبہ اپنے کمرے میں تھیں۔ یہاں پہنچ کر میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔ انہوں نے حیران پریشان ہو کر استفسار کیا۔ زخم تازہ تھا۔ درد انتہا پر تھا۔ ضبط نہ کر سکا۔ انہیں اپنے جگر کے شگاف دکھا لئے۔ میری رات کو دیر تک بیداری۔ صبح سویرے اُٹھنے کی وجہ مسلسل اس وقت تک کئی گھنٹے حاضر خدمت رہنے کے تمام اسباب وہ سمجھ گئیں۔ وہ ماں تو ضرور تھی لیکن مجبور۔ اُس کے پاس بھی آنسو تھے، دل کھول کر بہائے۔ اس کے بعد اپنا صندوق کھول کر زیورات کا ڈبہ میری طرف دیتے ہوئے بولیں۔ تمہارا شوق جنوں کی حد تک ہے۔ لیکن قدردان اُٹھ گئے ہیں کیا کر سکتی ہوں۔ جاؤ۔ یہ چیزیں لے جاؤ۔ تمہارا کام چلانے کیلئے غالباً کافی ہیں۔ یہاں سے بھاگ جاؤ، دنیا وسیع ہے اور جہاں اپنی پیاس بجھا سکتے ہو جاؤ۔ میری اجازت ہے۔ خدا تمہیں بامُراد واپس لائے۔ میں تمہارے انتظار میں عمر نوح بھی کاٹ سکتی ہوں۔" جواب این سخن چیست تو ہم میدانی؟ تقدیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور ہار کر بیٹھ گیا۔ "سکون کا دوسرا نام مایوسی کی انتہا ہے۔"

۱۹۷۷

مرحوم بخشی غلام محمد کی خدمت میں

ایک فریب خوردہ سیاسی کارکن کا معافی نامہ

محترم بخشی صاحب!

''آئینہ'' کے ذریعے پچھلے چند ماہ سے آپ کے کئی خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اور یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ سب لوگ جنت میں آرام سے اپنے دن کاٹ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ تک یہ خط پہنچنے کی کیا صورت ہے۔ اس لئے میں ''آئینہ'' ہی کی معرفت یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔ کیونکہ سنا ہے کہ یہ اخبار آپ کو وہاں باقاعدگی سے مل رہا ہے۔

میں کہہ نہیں سکتا، کہ آپ کو میری صورت یاد ہوگی یا نہیں، لیکن آپ کے بے پناہ حافظے سے یہ بات بعید نہیں، کہ آج ۲۴ر سال بعد بھی آپ کو میرا نام میری صورت اور میری سیاست سبھی کچھ یاد ہوگا۔ میں صرف آپ کو ۱۵ر اگست ۱۹۵۳ء کی وہ اندھیری رات یاد دلاتا ہوں کہ جب مجھے سنٹرل جیل سرینگر سے ایک پولیس گاڑی میں بند کر کے آپ کی سرکاری قیام گاہ پر لایا گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات آپ نے مجھے بغاوت کی راہ

ترک کر کے حکومت کے کاروبار میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ میں آج ۲۴ سال بعد بھی یہ بات نہیں بھولا ہوں۔ کہ آپ نے مجھے خدا اور خدا کے رسول کی قسمیں کھا کر یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ کہ شیخ صاحب، کشمیر اور کشمیریوں کے لئے نہیں اپنے لئے عزت و آبرو کا مقام چاہتے ہیں...... اور یہ کہ ۹ راگست کا حادثہ کسی غیر متوقع سیاسی صورت حال کا نہیں۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ دن ہے کہ آپ نے ابتدائی مشکلات اور مزاحمت پر قابو پا کر اپنے اقتدار کو مستحکم بنا لیا تھا۔ اور آپ کی آنکھوں سے وہ اعتماد پھوٹ پھوٹ پڑتا تھا کہ جس کے سہارے آپ نے بعد میں دس سال تک اس ریاست پر حکومت کی۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے اور یقیناً آپ کو بھی یاد ہو گا کہ میں نے آپ کی وضاحت کو نا قابل قبول اور آپ کی سیاست کو غداری سے تعبیر کر کے آپ کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ مجھے اور میری ہی طرح ہزاروں لوگوں کو اس بات کا یقین تھا۔ کہ آپ نے شیر کشمیر کو آزاد اور خود مختار کشمیر کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے روک کر کشمیر کے عظیم تر مفادات سے غداری کی ہے۔ سرینگر شہر کی شاہراہوں اور وادی کے دور افتادہ دیہات میں جو لوگ آپ کے خلاف مظاہرے کرتے ہوئے اپنی جان دے رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شیخ صاحب کشمیر کو ہندوستانی استبداد کے پنجے سے آزاد کر کے اسے پاکستان کے ساتھ ملحق کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آپ نے ہندوستان کا آلہ کار بن کر ان کے ارادوں کو ناکام بنا دیا۔ میری جرأت رندانہ کی داد دیجئے کہ میں نے آپ

کا ایک قیدی ہونے کے باوجود آپ کو صاف الفاظ میں بتا دیا کہ آپ نے کشمیر کی آزادی اور خودمختاری کی راہ میں حائل ہو کر ریاست کے چالیس لاکھ عوام سے غداری کی ہے۔ میں نے آپ کے پیش کردہ واقعات کو نظر انداز کر کے آپ کے مُنہ پر یہ بات، کہہ دی کہ آپ نے ایک بہت ہی حقیر مقصد کے لئے ایک عظیم مقصد، اصول اور نصب العین سے غداری کی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ میری گستاخی اور تلخ کلامی کو برداشت کیا تھا...... اور سنٹرل جیل روانہ کرتے وقت مجھ سے جو الفاظ کہے تھے۔ وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ''اچھا آج نہیں۔ تو پھر کسی دن تمہیں میری بات کا اعتبار آ جائیگا۔ اور جب تمہیں اس بات کا احساس ہو جائے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ثابت ہوا ہے۔ تو مجھ سے آ کر مل لینا۔''

محترم بخشی صاحب!

مجھے اس بات کا اعتراف کرنے دیجیئے کہ میں پورے بائیس سال تک اندھیرے کو روشنی جھوٹ کو سچ اور افسانے کو حقیقت سمجھنے کے جرم کا ارتکاب کرتا رہا۔ اور بائیس برس بعد جب میری آنکھیں کھل گئیں۔ تو آپ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ بائیس برسوں کے دوران میں نے آپ کی مخالفت اور آپ کی دشمنی میں کیا کچھ نہیں کیا۔ اس کا بہت سا ریکارڈ تو پولیس اور سی آئی ڈی کے کاغذات میں ملے گا۔ لیکن میرے دل میں آپ کے تئیں نفرت اور میری نگاہوں میں آپ کیلئے جو حقارت کا جذبہ موجود تھا،

اس کی شدت اور گہرائی کا اندازہ صرف مجھ کو ہی ہے۔ مجھے اس بات کا اقرار کرنے دیجئے کہ میں نے بارہا آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مجھے اس گناہ کا اقبال کرنے دیجئے کہ میں نے آپ کے دشمنوں سے مل کر آپ کی قیام گاہ کو بم کے دھماکے سے اُڑانے کا بھی منصوبہ بنایا تھا۔ کیونکہ میری نگاہوں میں اور میری ہی طرح کشمیر کے لاکھوں نوجوانوں کی نظروں میں آپ کشمیر کی غلامی محکومی اور ہندوستان سے اس کی مسلسل وابستگی کے ذمہ دار تھے۔ اور اس بات پر ہمارا ایمان تھا کہ اگر آپ شیر کشمیر کی راہ میں حایل نہ ہوتے تو شیخ صاحب اور بیگ صاحب نے کشمیر کو ہندوستان کے چنگل سے آزاد کر کے اسے یا تو خود مختار کشمیر بنا دیا ہوتا...... یا اسے پاکستان کا حصہ بنا کر مسلمانانِ کشمیر کے خوابوں کو پورا کیا ہوتا...... اس دوران آپ نے کشمیر کی سلمیت اور اندرونی تحفظ کے نام پر جتنے کالے قوانین نافذ کئے، ان سے ہمارے دلوں میں آزادی کی تپتی ہوئی آگ اور آپ کے تئیں نفرت کے شعلے کچھ زیادہ ہی بھڑک اُٹھے۔ ۱۹۵۳ء سے لیکر ۱۹۶۴ء تک آپ نے جب جب کشمیر اور ہندوستان کے قیامت تک ایک رہنے کی بات کی، تو میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ اس دوران آپ نے جب بھی پاکستان کے خطرے کا ذکر کر کے احتیاطی نظر بندی، وطن دشمنانہ سرگرمیوں یا غیر ملکی ایجنٹوں سے متعلق آرڈیننس نافذ کئے۔ تو ہم نے یہی سمجھا کہ آپ اپنے اقتدار کے تحفظ اور محبانِ وطن کی سرگرمیوں پر روک لگانے کے لئے یہ سب جتن کر رہے ہیں۔ اپنے عہدِ انتخابات میں دھاندلیاں کر کے اپنی جماعت کو

کامیاب کروایا، تو ہمارے اس خیال کو اور تقویت مل گئی۔ کہ یہ سب کچھ ہندوستان کے اشاروں پر ہو رہا ہے اور اس کا مقصد آپ کو ہر قیمت پر برسر اقتدار رکھنا ہے۔ غرض ان دس سالوں کے دوران آپ نے جو کچھ کہا۔ ہم نے اپنے طور اس میں کوئی نہ کوئی نقص اور خرابی نکال کر آپ کو بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ جب آپ نے کشمیری عوام کی غربت اور ان کے افلاس کے پیش نظر انہیں سستا راشن دینے کی اسکیم چالو کر دی۔ تو ہم نے اسے کشمیریوں کی غیرت اور ان کے جذبۂ خودداری کو ختم کرنے کی سازش سے تعبیر کیا۔ اور لوگ سستا چاول کھانے کے باوجود آپ کو گالیاں دیتے رہے۔ آپ نے کشمیر کی ثقافت اور تمدن کے فروغ کے لئے موسیقی اور موسیقاروں کی حوصلہ افزائی کی تو ہم نے اسے بے حیائی اور عریانی کا نام دے کر آپ پر کشمیر کی عزت آبرو سے کھیلنے کا الزام لگایا۔ آپ نے اگر کسی اخبار والے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا۔ تو ہم نے آسمان پر پر اُٹھالیا۔ اور آپ کو ظالم، جابر اور ڈکٹیٹر قرار دیا۔ آپ نے اگر اپنے کسی بھائی بند، عزیز یا قرابت دار کی مدد کی۔ تو ہم نے اسے آپ کی کنبہ پروری اور اقربا نوازی کا نام دے کر لوگوں کو یہ بتایا۔ کہ شیخ صاحب کو اسی لئے گرفتار کیا لیا ہے کہ وہ ان باتوں کے خلاف تھے...... آپ کے خلاف ہماری نفرت اور مخالفت کی مہم صرف آپ کے دورِ اقتدار تک ہی جاری نہیں رہی۔ بلکہ اس کے بعد بھی ہم نے ہر ہر قدم پر آپ سے انتقام لینے کی اپنی جنگ جاری رکھی۔ حد یہ ہے کہ ہم میں سے بہت لوگوں نے آپ کے جنازے پر پتھر پھینک کر اپنے غصے اور

برہمی کا اظہار کیا۔ اور مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی شرمندگی اور ندامت کا احساس ہورہا ہے۔ کہ میں ان لوگوں میں سے ایک تھا کہ جنہوں نے خانقاہ معلیٰ کے قبرستان سے آپ کی لاش نکال کر کہیں اور پھینک دینے کا منصوبہ بنایا تھا...... خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارا یہ منصوبہ ناکام ہوگیا۔ اور ہماری روح ایک مستقل عذاب سے بچ گئی۔

محترم بخشی صاحب!

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے گناہوں کی یہ طویل فہرست آپ کی خدمت میں کیوں پیش کر رہا ہوں۔ حیران نہ ہوجایئے۔ انسان بہرحال انسان ہے۔ اس سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ہر بات کو فوراً ہی سمجھ جاتے ہیں...... اور کچھ لوگوں کو صاف اور سیدھی بات سمجھنے میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ میرا شمار ان بدبختوں میں ہوتا ہے کہ جنہیں ان کا یقین، ان کا اعتماد اور ان کا اعتبار مار جاتا ہے، میں اپنے اس گناہ کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آج سے ۲۴ برس قبل آپ نے ۵/اگست کی رات کو جو بات مجھ سے کہی تھی اور جسے میں نے جھوٹ اور فریب سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا۔ آج ۲۴ سال بعد مجھ پر اس کی حقیقت واضح ہوگئی ہے اور گذشتہ دو سال کے تجربات نے آپ کی ہر بات صحیح اور میرا ہر اندازہ غلط ثابت کر دیا ہے۔ میں اپنے گناہوں کے عفو، اپنے جرائم کی معافی اور آپ کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کا اقبال کرنے کے لئے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اور اس اُمید پر لکھ رہا ہوں۔ کہ آپ رحم دل ہی نہیں، دریا دل بھی ہیں۔ اور آپ صرف

میری ہی نہیں، ان تمام معصوموں اور فریب خوردہ لوگوں کی خطائیں معاف کردیں گے ...... کہ جنہوں نے آپ کو گالیاں دیں۔ آپ پر پتھر اُٹھائے۔ آپ کی اور آپ کی قبر کی بے حرمتی کی یا جو پورے ۲۴ سال تک آپ کو غدار، وطن فروش اور ہندوستان کا آلہ کار سمجھنے کا گناہ کرتے رہے۔

محترم بخشی صاحب!

ہمارے احساس گناہ اور اقبالِ جرم کی شان نزول یہ ہے کہ فروری ۱۹۷۵ء میں جب ہمارے محبوب شیر کشمیر نے ۲۲ سال کی نظر بندی، جلاوطنی اور صحرانوردی کے بعد زمام اقتدار سنبھالی تو ہم نے یہ سمجھا کہ کشمیر کی آزادی اور عزت و آبرو کے بحال ہونے کی وہ شبھ گھڑی آن پہنچی ہے کہ جس کے انتظار میں ہم نے بائیس سال تک اپنی جوانی کا لہو اپنی انکھوں کی نیند، اپنے دلوں کا قرار غرض اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا ...... لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے۔ ہماری اُمیدوں کے چمن پر مایوسی کے بادل منڈلانے لگے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارے جانباز لیڈروں نے صرف لیلیٰ اقتدار کی خاطر اپنی جان کی بازی لگادی تھی۔ جن لوگوں نے ہمارے محبوب قائد کو نظر بند اور جلاوطن کر کے ہمارے سینے زخموں سے چھلنی کر دیئے تھے۔ ہمارے قائد اعظم کا رویہ ان کے ساتھ دوستانہ ہی نہیں۔ بلکہ عاشقانہ تھا۔ اس سے ہمارے جذبات بہت مجروح ہوئے۔ لیکن اس اُمید پر ہم یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ کہ بالآخر شیخ صاحب کشمیر کو آزاد کرانے کے اس منصوبے پر عمل درآمد شروع کردیں گے۔ کہ جسے آپ نے ۹ر اگست ۱۹۵۳ء

کو ناکام بنا کر ہمارے خوابوں کی دنیا لوٹ لی تھی۔ لیکن ہمارا اندازہ غلط ثابت ہونے لگا۔ شیخ صاحب اپنے بیانات اور فرمودات کے اعتبار کے ہی سے نہیں، اپنے عمل اور کردار سے بھی، آپ سے زیادہ ہندوستانی، آپ سے زیادہ وفادار، اور اطاعت شعار نظر آنے لگے۔ وہ صبح سے شام تک ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو اپنی وفاداری اور اپنے محبّ وطن ہندوستانی ہونے کا یقین دلاتے رہے۔ جن فوجی افسروں کو وہ غیر ملکی اور غاصب کہہ کر ہمارے دلوں میں بغاوت کی چنگاریاں روشن کیا کرتے تھے۔ قبلہ شیخ صاحب اب ان کے ساتھ ڈنر کھانے اور فوجی پریڈوں کا ملاحظہ کرنے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ شروع شروع میں ہم یہ سوچنے لگے۔ کہ شاید یہ ایک سیاسی مصلحت ہے اور جلد یا بدیر شیخ صاحب ۹ راگست کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے اقدامات کریں گے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم پر یہ حقیقت واضح ہوگئی۔ سیاسی لحاظ سے آپ کے موقف اور ان کے موقف میں ذرہ بھر کا فرق بھی نہیں، اور آپ ٹھیک ہی کہا کرتے تھے کہ میں تو شیخ صاحب کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا ہوں"

فروری ۱۹۷۵ء سے لیکر مارچ ۱۹۷۷ء تک ہم اپنے دل کو یہ تسلی بھی دیتے رہے، کہ شیخ صاحب کے پاس چونکہ اپنی اسمبلی نہیں ہے۔ اس لئے وہ کوئی انقلابی قدم اُٹھانے سے معذور ہیں۔ لیکن مارچ ۱۹۷۷ء کی انتخابی مہم نے ایک بار پھر ہماری اُمیدوں اور توقعات کے آنگن میں پھول کھلا دیئے۔ شیخ صاحب نے انتخابی مہم کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ اگر کشمیریوں کو

ہندوستان میں عزت و آبرو کا مقام نہ ملا، تو ہم ہندوستان سے الگ ہو جانے کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہیں۔ اشارہ بہت صاف اور واضح تھا۔ لیکن بیگ صاحب نے اسکو زیادہ بلیغ اور وزن دار بنانے کے لئے نعرہ دیا۔ کہ موجودہ انتخابات رائے شماری کا نعم البدل ہیں۔ اور انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے فوراً بعد ہم روالپنڈی روڈ کھولنے کا مطالبہ کریں گے۔ بس پھر کیا تھا، معلوم، سادہ لوح اور اپنے قائداعظم کی بات پر یقین کرنے والے لوگوں نے انہیں بے تحاشہ ووٹ دیئے اور مجھے اپنے اس گناہ کا اعتراف کرنے دیجئے۔ کہ اس دوران، میرے دل میں آپ کے خلاف نفرت اور حقارت کا طوفان ایک نئی شدت کے ساتھ ابھر آیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ آپ نے ۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب اور ان کے اصولوں کے ساتھ غداری نہ کی ہوتی، تو ہمارے محبوب رہنما کو بستر علالت سے قوم کو آزادی اور عزت و آبرو کی اس فیصلہ کن جنگ میں انہیں ووٹ دینے کی اپیل نہ کرنا پڑتی۔ انتخابات ہوئے اور ہندوستانی لیڈروں اور وزیروں کی منت سماجت اور مداخلت کے باوجود ہم نے ایکبار پھر شیر کشمیر اور ان کے کھمبوں کو ووٹ دے کر انہیں اقتدار کی کرسی پر بٹھا دیا۔ اب کی بار ہمارے لیڈر کے پاس سب کچھ تھا۔ حکومت بھی اسمبلی بھی، اور بے پناہ عوامی اعتماد بھی۔ اور اب ہم اس انتظار میں تھے، کہ آج نہیں تو کل آپ کی تعمیر کردہ طاغوتی نظام کی عمارت کو ڈھا کر شیر کشمیر اور ان کے دست راست مرزا محمد افضل بیگ، ایک نئے نظام، ایک نئے کشمیر اور ایک نئی صبح کا پیغام دیں گے۔ لیکن اب کی بار بھی ہمارا اندازہ

غلط اور ہمارے قیاسات بے بنیاد ثابت ہوئے، اور اسی لئے ہمیں آپ سے معافی مانگنے کے سوا اپنی روح کو مستقل عذاب سے بچانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔

محترم بخشی صاحب

وزیراعلیٰ کی حیثیت سے حلف لیتے وقت ہی شیخ صاحب نے ہندوستان کو مضبوط بنانے کا عہد کرلیا، انہوں نے صاف صاف الفاظ میں کہا کہ کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک ہندوستان ایک ہے۔ اور مجھے صرف کشمیر سے دلچسپی نہیں، سارے ہندوستان کا غم ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں ہندوستان کو گاندھی جی کے خوابوں کے مطابق ڈھالنے اور سنوارنے میں اپنا رول ادا کرنے کیلئے بے چین ہوں۔ شیخ صاحب کی اس تقریر پر جہاں اس ریاست کے ہندوستان نواز حلقے تالیاں بجا رہے تھے۔ وہاں ہم یہ سوچ رہے تھے، کہ اگر ۲۴ سال بعد بھی وہ یہی چاہتے ہیں۔ تو پھر ۲۴ سال پہلے جھگڑا کس بات پر تھا۔ میرے ایک دوست نے ۱۹۵۴ میں اننت ناگ کے جلسہ عام میں ایک اخبار میں چھپی ہوئی آپ کی ایک تقریر کا اقتباس دکھا کر مجھ سے پوچھا، کہ بتاؤ شیخ صاحب کی آج کی تقریر اور بخشی صاحب کی اس تقریر میں کیا فرق ہے۔ تو واللہ! مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہ شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں من وعن آپ ہی کے الفاظ دہرائے تھے۔ اس کے بعد سے آج تک شیخ صاحب نے اپنی درجنوں تقریروں میں اس خیال کو ان ہی الفاظ میں دہرایا ہے۔ اب ان کی زبان پر نہ کبھی عزت و آبرو کے الفاظ آتے

ہیں۔اور نہ کبھی آزادی کا نام۔آپ کے اقتدار کے دس برسوں میں انہیں اپنا ہر مخالف مرکزی انٹلی جنس بیرو کا ایجنٹ نظر آتا تھا۔لیکن جب سے وہ صاحب اقتدار ہو گئے ہیں۔ وہ آئے دن آئی بی کے افسروں کے ساتھ ریاست کی اندرونی صورت حال کے بارے میں مشورے کرتے رہتے ہیں۔آپ پر یہ الزام تھا کہ آپ ہندوستانی لیڈروں کو خوش کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم بناتے رہتے ہیں۔لیکن شیخ صاحب نے صدر جمہوریہ ہند کے اعزاز میں، بری، بحری اور ہوائی جلوس نکال کر انہیں اتنا خوش کر دیا کہ اس نے وفور مسرت سے بے خود ہو کر انہیں شیر بھارت کا خطاب دیا۔اس طرح شیخ صاحب نے بھی حال ہی میں ہندوستان کی سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور صدر کانگریس ہمانند ریڈی کو اپنا ذاتی مہمان بنا کر ہندوستانی لیڈروں سے اپنے تعلقات خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ انہیں جب بھی موقع ملتا ہے۔وزیر اعظم شری مرارجی کی تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتے ہیں۔یہ تو رہا شیر کشمیر کا حال، اب فخر کشمیر کا حال ملاحظہ کیجئے۔ وہ آئے دن دہلی جا کر مرکزی لیڈروں سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔اور ملاقات کے فوراً بعد اخبارات کے نام یہ بیان جاری کرتے ہیں، کہ ریاست اور مرکز کے تعلقات بے حد خوشگوار ہیں اور مرکزی حکومت نے ریاستی حکومت کی بھرپور مالی امداد کرنے کا یقین دلایا ہے۔جب کوئی مرکزی وزیر ریاست میں وارد ہوتا ہے تو ہمارے قائدین اس کی راہوں میں اس طرح آنکھیں بچھاتے ہیں۔کہ جیسے وہ پچھلے ۲۶ سال سے اس کے منتظر بیٹھے تھے۔مختصر یہ کہ آپ

کے اور ان کے طریقہ کار، سٹائل اور طرز حکومت میں بھی کوئی اب فرق نظر نہیں آتا۔ کہ جس سے ہمیں یہ محسوس ہو، کہ آپ سیاست، اعتقادات یا نظریات کے اعتبار سے ان سے کسی طرح بھی مختلف تھے۔ بلکہ ان کی تقریریں سن کر اب محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہم آپ کی تقریروں کے گراما فون ریکارڈ سن رہے ہیں۔ غرض سیاسی سطح پر ہمارے شیر کشمیر اور ان کے قانونی مشیر فخر کشمیر نے ہمیں کوئی ایسا تاثر نہیں دیا ہے، کہ جس سے ان بنیادی اختلافات'' کی نشاندہی ہو سکے، کہ جو ۱۹۵۳ء کے حادثے کی بنیاد بن گئے۔ اور آپ کا یہ فرمان بالکل صحیح ثابت ہو رہا ہے کہ ۱۹۵۳ء کا حادثہ شیخ صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی ''انانیت کا نتیجہ تھا''۔

ہم نے سوچا تھا کہ چلو شیخ صاحب کم از کم ریاست میں انتخابات کے معاملے میں آپ سے مختلف ہوں گے۔ لیکن ہمارا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ابھی تک دو انتخابات کروائے۔ ایک مارچ ۱۹۷۷ء میں بیگم صاحبہ کا پارلیمانی انتخاب، دوسرا ابھی حال کا پنچایتی انتخابات، اول الذکر کر کے بارے میں آپ کو سب کچھ معلوم ہے اور اس سلسلے میں آپ کا ان کے نام لکھا ہوا خط میں نے اسی اخبار میں پڑھا ہے۔ اب رہے پنچایتی انتخابات سو اس کے بارے میں خود محترم بیگ صاحب نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ''ان میں بخشی صاحب کے دور کی دھاندلیوں کا ریکارڈ بھی مات کر دیا گیا ہے''، میرا ذاتی خیال ہے کہ ان انتخابات کے دوران جس قسم کی بے ضابطگیاں اور بدعنوانیاں کی گئی ہیں وہ آپ کے زرخیز دماغ میں

بھی نہیں آسکتی تھیں۔ اس سے پہلے کواپریٹوں اداروں کے انتخابات میں بھی بے ایمانیوں اور بے راہ رویوں کے نئے ریکارڈ قائم کیئے گئے تھے۔ قصہ مختصر کہ اس میدان میں بھی شیخ صاحب نہ صرف آپ کے تجربے دہرا رہے ہیں بلکہ انہیں زیادہ موثر اور کارگر بنارہے ہیں اور اس پس منظر میں یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کہ ہمارے دلوں میں آپ کے خلاف بغض، کینہ، عداوت اور کدورت کا کیا جواز ہے۔ کچھ دنوں تک تو ہم یہ سوچتے رہے کہ شیخ صاحب کو آپ نے اتنا عرصہ جیل میں بند رکھ کر اپنے فسطائی ہونے کا ثبوت دیا۔ لیکن جولائی کے مہینے میں جب شیخ صاحب نے اقتدار سنبھالتے ہی کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے غلام نبی کو میسا کے تحت نظر بند کر کے انہیں رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ تو ہمیں اندازہ ہوا کہ سیاسی انتقام گیری میں بھی شیخ صاحب آپ سے کم نہیں۔ ایک معمولی ڈرائیور کے ساتھ ایک عظیم لیڈر کی یہ دشمنی دیکھ کر تو بہت سے لوگوں نے یہ کہا کہ بخشی صاحب کبھی ایسا نہیں کرتے۔

محترم بخشی صاحب!

میں جانتا ہوں کہ میری زبان سے یہ حکایت سن کر آپ مسکرا رہے ہوں گے۔ اور آپ کو ۱۵/اگست ۱۹۵۳ء کی وہ اندھیری رات یاد آرہی ہوگی ۔ کہ جب آپ نے میری آنکھوں سے اندھی عقیدت اور جہالت کا پردہ اُٹھانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مجھے اپنے گناہوں کا نہ صرف اعتراف ہے۔ بلکہ میری گنہگاری کا احساس روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ انتخابی مہم کے دوران شیخ صاحب نے بلواسطہ اور بیگ صاحب نے براہ

راست ہمیں اس بات کا یقین دلایا تھا۔ کہ وہ راولپنڈی روڈ کھلوا دیں گے۔ مجھے ذاتی طور پر تو نہیں، لیکن بہت سے لوگوں نے قائدین محترم کی اس یقین دہانی پر اعتبار کر کے نیشنل کانفرنس کو بے تحاشہ ووٹ دیئے تھے۔ راولپنڈی روڈ کا کھولنا تو بہر حال شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن کم از کم پاکستان کے موجودہ بحران میں پاکستانی عوام کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ پچھلے چار ماہ کے دوران شیخ صاحب یا بیگ صاحب نے ایک بار بھی پاکستان کے عوام کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم کرنے کی غاصبانہ کوششوں کے خلاف احتجاج نہیں کیا ہے۔ جبکہ جے پرکاش نرائن کئی بار پاکستان کی فوجی آمریت کے خلاف اپنے غم وغصے کا اظہار کر چکے ہیں۔ بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا۔

(یہ مضمون اتنا ہی دستیاب ہوا)۔

۱۹۷۷

سابق ممبر پارلیمنٹ کا خط
نئے ممبر پارلیمنٹ کے نام

مادر مہربان

آج آپ کے حلقہ انتخاب سرینگر میں ووٹ ڈالے جارہے ہیں۔اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ اپنے دوستوں کی نادانیوں اور دشمنوں کے مخالفانہ پروپگنڈے کے باوجود بھاری اکثریت سے جیت جائیں گی۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں آپ کی انتخابی مہم میں براہ راست شریک ہوکر آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکا۔لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ بیرون ریاست میں میری مصروفیتوں کے پیشِ نظر میری ، اس کوتاہی کو نظرانداز کردیں گی۔ میں آپ کی کامیابی کا باضابطہ اعلان ہونے سے پہلے، آپ کو یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کی کامیابی میں کوئی شک نہیں ، میں اس اہم اور تاریخ ساز مرحلے پر آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہی اس خط کی شان نزول ہے۔

بیگم صاحبہ

یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ ہندوستانی تاریخ کے ایک ایسے اہم اور نازک مرحلے پر ہندوستان کے ایوان عام میں جارہی ہیں کہ جب جمہوریت اور آمریت کی جنگ ایک فیصلہ کن صورت اختیار کرگئی ہے۔ پارلیمانی انتخابات کے نتائج، جو کچھ بھی ہوں یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ حکمران کانگریس اوراس کی قائد مسز اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کے نام پر گذشتہ بیس ماہ کے دوران جو طوفان بدتمیزی بپا کررکھا تھا۔ ہندوستانی عوام اب اسے دہرانے یا جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ ہندوستانی پارلیمنٹ کا موجودہ رول صرف ہمارے حال کو ہی نہیں، مستقبل کو بھی متاثر کرے گا۔ اوراس لحاظ سے ہرممبر کی ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ میری خواہش ہے کہ پارلیمنٹ کے مقدس ایوان میں قدم رکھنے سے پہلے آپ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کو اچھی طرح سے سمجھ لیں اوراس بات کا فیصلہ کریں کہ آپ وہاں شیخ صاحب کی رفیقہ حیات کی حیثیت سے جائیں گی۔ یا سرینگر کے رائے دہندگان کے جذبات کی ترجمانی اوران کے مفادات کی نگرانی کا فرض انجام دیں گی؟ یہ سوال اس لئے اہم بن گیا ہے کہ شیخ صاحب نے جن شرائط پر اور جس ماحول میں وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ اس کے پیش نظر ان کے لئے حکمران جماعت کی ہر بات اور وزیراعظم کے ہرفرمان کی تائید کرکے اسے تسلیم کرنا ضروری ہے، ان کی رفیقۂ حیات کی حیثیت سے ابھی تک آپ سے

بھی یہی توقع تھی کہ آپ ان کی موجودہ ذمہ داریاں نبھانے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ لیکن پارلیمنٹ کا ممبر پارلیمنٹ کا ممبر ہوتا ہے۔ کسی کی بیوی یا شوہر نہیں ہوتا۔ اس لئے آج کے بعد سے آپ بیگم عبداللہ ہی نہیں۔ سرینگر کی ممبر پارلیمنٹ بھی ہیں۔ اب آپ کا ایک الگ وجود ہے۔ ایک الگ شخصیت ہے اور یہ ضروری نہیں کہ آپ ہر بات میں اور ہر مسئلے پر ریاست کے وزیر اعلیٰ سے متفق ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے سرتاج کی سیاسی مجبوریوں اور سرکاری مصلحتوں کی سطح سے بلند ہو کر پارلیمنٹ میں اپنے ضمیر اور ریاستی عوام کے جذبات کی ترجمانی کریں گی۔ کم از کم ہندوستان کے عوام اور آپ کے رائے دہندگان آپ سے یہی توقع رکھتے ہیں۔

مادرِ مہربان!

یہ بات چھوٹا مُنہ اور بڑی بات کے مصداق ہے کہ میں آپ کو یاد دلاؤں کہ آپ لوک سبھا میں میری نشست پر بیٹھنے والی ہیں۔ مجھ میں بہت سی کوتاہیاں اور کمزوریاں ہیں اور آپ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن مجھے اس تعلّی کی اجازت دیجئے کہ میں نے پچھلے چھ برس کے دوران، پارلیمنٹ میں اپنی کارکردگی سے کشمیر کا نام روشن کیا ہے۔ پارلیمنٹ کے در و دیوار گواہ ہیں کہ پارلیمنٹ میں قدم رکھتے ہی، میں نے اس جرأت اور جواں مردی سے کشمیر کا مقدمہ ہندوستانی عوام کی عدالت میں پیش کیا کہ جو کان پچیس برس سے بہرے ہو چکے تھے وہ بھی میری آواز سن کر، میری طرف متوجہ ہوئے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۷۱ء میں شیخ صاحب کا نام

لے کر کشمیری عوام سے انصاف کرنے کا مطالبہ کرنے کے جرم میں کانگریسی ممبران پارلیمنٹ ہی نہیں۔ مرکزی وزیر بھی میرے خلاف آوازیں کستے تھے ،لیکن رفتہ رفتہ ساری پارلیمنٹ میری جرأت اور میری حق گوئی سے اس درجہ مانوس ہوگئی کہ میرا شمار پارلیمنٹ کے ان پانچ چھ ممبروں میں ہوتا تھا۔ کہ جن کی تقریر کو بڑی توجہ بڑے ضبط اور سکون سے سنا جاتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ پچھلے چھ سال کے دوران میں نے بارہا حکمران جماعت کے بڑے بڑے گرانڈیلوں سے ٹکر لی ، اور اس طرح ثابت کردیا کہ کشمیر کا نوجوان طاقت اور اقتدار سے مرعوب ہوئے بغیر اپنے دل کی بات زبان پر لانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے بھی اور آپ کے سرتاج نے بھی متعدد بار میری جرأت رندانہ کی داد دے کر میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ پارلیمنٹ کی پریس گیلری میں بیٹھنے والے اخباری نمائندے اس بات کی شہادت دیں گے کہ میں نے پچھلے چھ سال کے دوران ہر مسئلے اور ہر موضوع پر انتہائی بے باکی سے اپنا نقطہ نگاہ پیش کرکے ،صرف پارلیمنٹ ہی میں نہیں، ملک بھر میں نام پیدا کرلیا ہے۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد جب اپوزیشن کے بڑے بڑے پہلوان بھی مسز گاندھی سے مرعوب ہوکر خاموشی کو ہی گفتگو کی زبان بنا بیٹھے تھے، میں نے نتائج وعواقب کی پروا کئے بغیر بھرے اجلاس میں وزیراعظم کو ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا، مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میرے ان ہی ’’جرائم‘‘ کی پاداش میں مجھے اب کی بار پارلیمانی نشست سے محروم رکھنے کی سازش کی گئی۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نہ اپنے کئے پر نادم ہوں اور نہ ہی مجھے

اپنے انجام پر کوئی افسوس ہے، مجھے اگر ایک بار پھر اس ایوان میں جانے کا موقعہ ملے، تو میں اسی طرح وہاں اپنے ضمیر کی آواز بلند کرتا رہوں گا۔ اور یہ باتیں آپ کو صرف اس لئے یاد دلا رہا ہوں کہ آپ پارلیمنٹ میں میری نشست پر بیٹھنے والی ہیں اور غلط یا صحیح، پارلیمنٹ کے ہر اجلاس میں بہت سے لوگوں کی نظریں اس نشست پر مرکوز رہا کریں گی۔ اخباری نمائندے، پبلک گیلریوں میں بیٹھے ہوئے لوگ، حکمران جماعت کے ممبر اور حزب مخالف سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگ میری نشست کی طرف دیکھ کر آپ سے یہی توقع رکھیں گے کہ آپ بھی مصلحتوں اور مجبوریوں کی پروا کئے بغیر ویسے ہی حرف حق زبان پر لایا کریں گی کہ جس طرح میں کیا کرتا تھا۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری نشست کی لاج رکھئے اور ساری دنیا کو بتا دیجئے، کہ کشمیری اقتدار پرست اور جاہ پرست نہیں، حق پرست ہیں۔ یہ بات اس لئے ضروری بن گئی ہے کہ ہمارے بڑے بڑے لیڈروں کے متعلق یہ مشہور ہو گیا ہے، کہ وہ اقتدار کی خاطر اصول ہی نہیں، اپنی ساری متاع لٹانے کے لئے بھی تیار ہیں۔ کیا میں یہ اُمید رکھوں کہ آپ اس الزام اور اتہام کو غلط ثابت کرنے کے لئے ہر موقعہ اور ہر مرحلے پر حق وصداقت کا ساتھ دیں گی؟۔

فقط

آپ کا مخلص!

شمیم

۱۹۷۱

سرکاری ملازمین کے نام

گاہے گاہے باز خواں

ریاست جموں وکشمیر میں ایک بار پھر انتخابات کے نام پر ایک ناٹک رچانے کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کے ریاست میں داخلے پر پابندی، محاذ رائے شماری کے سینکڑوں اور نجلنگپا کانگریس کے درجنوں کارکنوں کی گرفتاری، الفتح، اور البرق کے ''مجاہدین'' کی دریافت، یہ سب کچھ اسی ناٹک کو سٹیج کرنے کی تیاریوں کا حصہ ہے اور اب اگلے ماہ اس کا آخری سین ''پیش کر کے ناٹک ختم ہونے کا اعلان کردیا جائیگا۔

حسب معمول اور حسب دستور اس ''آخری سین'' کو پیش کرنے میں آپ کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ اور آپ سے یہ توقع رکھی جائے گی۔ کہ آپ اپنے ضمیر اور اپنے ایمان اپنی آتما اور اپنی عاقبت کو چند ٹکوں کی ہوس میں بیچ کر جمہوریت، انسانیت اور شرافت کا خون کردیں۔ دوسرے الفاظ

میں اپنے چہروں پر اتنی کالک مل لیں، کہ حکمرانوں کے گھناؤنے اور بھیانک چہروں کی سیاہی بھی ماند پڑ جائے میری اطلاع ہے کہ اب کی بار آپ کی خدمات کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس کی جارہی ہے اور آپ میں سے بہت سے جانبازوں نے بے ایمانی اور رسوائی کی قربان گاہ پر اپنے ضمیر کا خون نچھاور کرنے کی پیش کش کی ہے میں نہیں جانتا کہ میری اطلاع کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن اگر ماضی بعید کے تجربات اور ماضی قریب کے واقعات، آئندہ حادثات کی نشان دہی کرنے کے لئے کافی ہوسکتے ہیں۔ تو مجھے یہ فرض کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ کہ آپ میں سے بہت سے لوگ آج بھی چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر اپنی اوقات اور اپنی عاقبت خراب کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اور آپ کی اسی کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر پچھلے بیس سال سے زیادہ عرصہ کے حکمران آپ کو ہر ممکن چوری، سینہ زوری، بدمعاشی، بدعنوانی، بدکرداری اور بداعمالی کیلئے استعمال کرتے آئے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں اتنی بلند سطح پر انتخابات لڑے گئے کہ چھوٹے اور بڑے افسروں کو اپنے کرتب دکھانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ عام لوگوں کی طرح سرکاری افسروں نے بھی ریڈیو پر ہی یہ خبر سنی، کہ ریاست میں پہلی آئین ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے بعد سے اب تک جتنے انتخابات ہوئے۔ ان میں عوام کے مقابلے میں سرکاری افسروں کی شرکت نمایاں طور پر غالب رہی ہے۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ سرکاری افسروں کی

شرکت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے اور اس طرح آپ میں سے بہت سے لوگوں کو اپنے جوہر دکھانے کے مواقع ملتے رہے ہیں۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں آپ کے بعض بھائی بندوں نے جمہوریت اور انسانیت کا گلا گھونٹنے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ اور انہیں دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں بعض ادنیٰ اور اعلیٰ افسروں نے جس بے شرمی، بے حیائی اور غنڈہ گردی کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے آپ کی شہرت اور آپ کے وقار کو اس حد تک مجروح کر دیا۔ کہ سرکاری افسروں اور جیب کتروں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ کاغذات نامزدگی میں سے حلف ناموں کی چوری، اُمیدواروں کو مرعوب اور رائے دہندگان کو خوفزدہ کرنے، بیلٹ پیپرس کی تقسیم میں خیانت اور بیلٹ بکسوں کی عصمت لوٹنے میں بعض سرکاری افسروں نے بھوپت اور مان سنگھ جیسے ڈاکوؤں کو بھی مات کر دیا۔ میں ان لٹیروں اور رہزنوں کے نام لے کر اپنے قلم کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا، لیکن آپ میں سے ہر شخص ان کے کام اور انجام سے واقف ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اس تاریخی مرحلے پر کہ جب ایک بار پھر ریاست کے حکمران جمہوریت کے قتل، انصاف کی پامالی اور انسانیت کی رسوائی کیلئے آپ کو آلہ کار بنانا چاہتے ہیں آپ اپنے انجام پر غور کریں۔

آپ کو اس بات کا احساس ہوگا کہ ہر انتخاب کی آمد پر حکمرانوں کو

ایک لخت آپ کی مشکلات، آپ کے مسائل اور مطالبات کی یاد آتی ہے۔
اور آپ کو وعدوں کے کھلونے دے کر بہلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس
فوری محبت اور ''عارضی الحاق'' کا مقصد آپ کو ان گناہوں کی ترغیب دینے
کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا، کہ جن کی بنیاد پر ریاستی حکمران اپنے اقتدار کا ششیں
محل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بار بار دھوکہ کھانے کے
بعد بھی آپ ہر بار دھوکہ کھانے پر تیار ہوتے ہیں۔آپ نے کبھی اس بات پر
بھی غور کیا ہے کہ آپ کی چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں، ننھی ننھی لغزشیں اور
بظاہر بے ضرر سی تغافل شعاریاں، کتنی بڑی حقیقتوں کو مسخ کر دیتی ہیں۔
آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اپنے ضمیر کا خون کرتے ہوئے آپ
انصاف، صداقت اور عوامی اعتماد کے کتنے بڑے آدرشوں کو پاؤں تلے روند
دیتے ہیں۔آپ کو کبھی یہ احساس ہوا ہے کہ گذشتہ بیس سال میں آپ کی بد
دیانتی، فرض ناشناسی اور بے ایمانی سے کشمیر کی تاریخ اور جمہوریت کی تحریک
کو کیا کیا صدمے اُٹھانے پڑے ہیں؟ آپ کو اس بات کا علم ہے، کہ آپ
کے کندھے پر بندوق رکھ کر تاریخ کے کارواں کو قزاقوں اور رہزنوں نے
منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ لیا؟ میں پوچھتا ہوں، کہ تم نے یہ سب کچھ
کیوں کیا؟ تمہیں اس خون ناحق سے ملا کیا؟ ناجائز ترقی کا وعدہ پچاس
روپے کا فائدہ حکمرانوں کی خوشنودی، کیا اس ''معاوضے'' سے ان گناہوں کا
کفارہ ادا کر سکتا ہے کہ جو تمہارے ہاتھوں سرزد ہوئے اور تم میں سے کتنے

ایسے ہیں کہ جن کے ساتھ کئے گئے وعدے پورے کئے گئے؟ میں درجنوں نہیں سینکڑوں ایسے سرکاری ملازمین کو جانتا ہوں کہ جنہوں نے انتخابات کے دوان اپنا مُنہ کالا کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی اور انتخابات کے بعد جب وہ معاوضہ حاصل کرنے کے لئے حکمرانوں کے دروازے پر گئے تو انہیں کُتے کی طرح دھتکار کر اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ اور شرافت کے تقاضے مانع نہ ہوتے۔ تو میں ایسے افسروں کے نام لے کر آپ کی آنکھیں کھول دیتا۔ بہر کیف، میرے کہنے کا صرف یہ مقصد ہے، کہ بے ایمان، بددیانت اور بدکردار لوگوں کی وہ بھی عزت نہیں کرتے، کہ جن کی خاطر وہ اپنی عزت، شہرت اور دیانت کو نیلام کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سبق ہے، کہ جو ہر سرکاری ملازم کو ہر وقت یاد رکھنا چاہیے۔

دوستو! خدا کے فضل اور ہندوستانی آئین کی مہربانی سے تمہارے حقوق محفوظ ہیں۔ تمہیں سرکاری ملازمت سے کوئی بلاوجہ سبکدوش نہیں کرسکتا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے تمہارا تنزل بھی نہیں ہوسکتا۔ تمہاری ترقی کے لئے بھی قواعد وضوابط مقرر ہیں۔ اور اگر ان کے خلاف ورزی کر کے تمہیں نظر انداز کر دیا جائے تو عدالت عالیہ کے دروازے کھلے ہیں۔ پھر تم حکمرانون کی خوشنودی کرنے کے لئے ہر وقت، بے ایمانی پر کیوں کمر بستہ رہتے ہو۔ تمہیں قانون اور آئین نے جو تحفظات دیئے ہیں۔ وہ اگر نہ بھی ہوتے۔ تب بھی تم پر اپنے ضمیر اور اپنے ایمان کو بچانا فرض تھا۔ اس لئے

میں نہیں سمجھتا کہ ترقی کے ہر وعدے اور معاوضے کی ہر پیش کش پر تمہاری رال کیوں ٹپکنے لگتی ہے؟ حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اپنے ناپاک وجود کو تمہارے ضمیر کا خون پلا پلا کر فربہ بنا دیا ہے۔ اور تم اپنی محدود دنیا میں اس بات پر خوش نظر آرہے ہو کہ تمہیں چند مسکراہٹوں اور عنایتوں کی بھیک مل رہی ہے۔ انسانی ذلت اور اخلاقی انحطاط کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے۔

ایک ماہ کے بعد لوک سبھا کی چھ نشستوں کے لئے انتخابات منعقد ہوں گے اور اس وقت سرکار ایسے منظور نظر" افسروں کی فہرست مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ کہ جو چند ٹکوں کے عوض اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ریٹرننگ افسروں، پریذائیڈنگ افسروں کی ایک فوج تیار کرنے کا منصوبہ باندھا جارہا ہے، کہ جو سیاست دانوں کے ایک اشارے پر جمہوریت اور انسانیت کی آبرو لوٹنے کیلئے تیار ہو۔ میں نہیں جانتا کہ آپ میں سے کتنے لوگ اس چنگیزی فوج میں بھرتی ہو کر حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہاں میں ایسے افسروں کو بھی جانتا ہوں کہ جو حکمرانوں اور سیاست دانوں کی بجائے اپنے ضمیر کا حکم مانتے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا افسوس اور احساس ہے کہ ایسے افسروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے انتخابات کیلئے مقرر کئے جانے والے سرکاری افسروں سے میں آج بھی وہی بات کہوں گا۔ کہ جو میں نے آج سے چار سال پہلے ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے موقع پر کہی تھی۔

''آئینہ'' میں سرکاری افسروں کے نام کھلی چھٹی کے عنوان سے ۱۸ر فروری کو میں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

''سرکاری افسرو! اس بات کا زبردست اندیشہ ہے کہ ایک بار پھر تمہارے کندھوں پر بندوق رکھ کر شکار کھیلنے کی کوشش کی جائے اس بات کا بھی امکان ہے کہ تم لوگ اپنی عادت اور اپنے ماضی سے مجبور ہو کر خواہ مخواہ بے ایمانی پر اُتر آؤ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگوں کی خدمات صرف اس غرض کیلئے حاصل کی گئی ہوں کہ تمہیں کسی ذلیل اور گھناونے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ بہرحال کچھ بھی ہو...... میں ایک اچھے دوست اور مخلص ساتھی کی حیثیت سے تمہیں مشورہ دیتا ہوں۔ کہ ماضی کی لغزشوں سے سبق سیکھ کر اپنا مستقبل اور اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر کرو، تم بہت چھوٹے آدمی ہو مگر تاریخ نے تمہیں بڑا منصب عطا کیا ہے۔ تمہاری ایمانداری اور بے ایمانی پر اس نئے دور کا طلوع منحصر ہے کہ جس کی آمد نے لاکھوں دلوں میں اُمیدوں اور تمناؤں کا محشر بپا کیا ہے۔ اگر تم نے اب کی بار ایمان اور دیانت کی شمعیں روشن رکھیں، تو تمہارے سارے گناہ معاف کئے جائیں گے، لیکن اگر تم نے آج بھی چند افراد کو مطمئن کرنے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے یا چند حقیر مراعات کی خاطر تاریخ کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی تو یاد رکھو، کہ آئندہ آنے والی نسلیں تم پر لعنت بھیجیں گی۔ اور تمہاری آئندہ نسل تاریخ کی نظروں میں ہمیشہ مردود اور

معتوب سمجھی جائیگی۔ وہ لوگ جن کو خوش کرنے کے لئے آج تم انصاف اور جمہوریت کا خون کروگے، کل اس سیلاب میں خود بھی تنکے کی طرح بہہ جائیں گے اور تم اپنے ضمیروں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لئے دیوانہ وار سڑکوں پر پھرتے ہوئے نظر آؤ گے۔ اگر کسی وقتی انعام کیلئے تمہارے پائے استقلال میں کوئی لغزش آئی۔ تو یاد رکھو کہ تم کبھی معاف نہیں کئے جاؤ گے۔ تمہارے ضمیر کی خلش تمہیں کبھی آرام کی نیند نہیں سونے دے گی۔ تم میں سے بہت سے لوگ پاگل ہو کر دیواروں سے اپنا سر ٹکرائیں گے۔

اور میری اس پیشینگوئی کے ثبوت میں اسی شمارے میں ''ووٹ چور بھائیوں کے نام'' ایمان کے ایک سوداگر کا عبرت نامہ ملاحظہ کیجئے۔

فقط میں ہوں آپ کا مخلص

چراغ بیگ

میرے خطوط
سنسر کرنے والوں کے نام

پیارو!

پچھلے دو سال سے تمہیں جس اہم کام پر مامور کیا گیا ہے، اس کو انجام دینے میں تم نے جس خلوص، لگن اور احساس فرض کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ خدا کرے کہ وزیر داخلہ بھی تمہارے کام سے اسی طرح مطمئن ہوں جس طرح چراغ بیگ ہے مُجھ سے اگر کبھی ان کی ''ناگہاں'' ملاقات ہو جائے تو میں انہیں بتا دوں گا کہ ان کی وزارت سے پہلے ایک آدھ خط کبھی کبھار بغیر سنسر ہوئے پہنچ ہی جاتا تھا۔ لیکن جب سے انہوں نے اندرونی امن و امان کو برقرار رکھنے کیلئے مسند وزارت کو زحمت دی ہے۔ کاغذ کا ایک پُرزہ بھی تمہاری نگاہوں سے بچ کر نہیں جاتا۔ ڈاک سے آئے ہوئے بجلی اور ٹیلی فون کے بل بھی باضابطہ سنسر ہو کر میرے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ تمہاری اعلیٰ کارکردگی اور فرض شناسی کے لئے تمہیں پدم بھوشن بھی مل جائے۔ تو کم ہے (یہ الگ سوال ہے کہ تمہاری کارکردگی کو اپنی اہلیت جتا کر وزیر داخلہ اس اعزاز کو بھی اپنے ہی لئے مخصوص کروائیں گے) حکم

کے غلامو! تم مجھے ذاتی طور پر نہیں جانتے ہو۔ لیکن خطوط چونکہ شخصیت کا حقیقی اظہار ہوتے ہیں، اس لئے میرے خطوط اور میرے نام آنے والے خطوط سے تمہیں میرے بارے میں وہ بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہوں گی جو میرے بہت قریبی دوستوں اور جاننے والوں کو بھی معلوم نہ ہوں گی۔

ہر انسان کے کچھ راز ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معصوم سے راز جنہیں وہ اپنے کمزور لمحات میں اپنے کسی دوست، کسی ہمدم یا ہم سفر پر آشکارا کردیتا ہے۔ میرے خطوط کے مسلسل مطالعے سے تمہیں میری زندگی کے ہر گوشے تک رسائی حاصل ہوئی ہوگی۔ تم میں سے اگر کوئی صاحب نظر ہے (جانتا ہوں کہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے) تو اُسے میری زندگی کے چھوٹے چھوٹے رازوں کو چراتے ہوئے اپنے وجود سے نفرت کا احساس ہوگیا ہوگا۔ اس نظام سے نفرت ہوگئی ہوگی جو وہم اور شک کی بنیاد پر فرد کی ذاتی زندگی کے تقدس کو بھی پامال کردیتا ہے۔

میری معصوم کائنات کے رہزنو! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ تم جو کچھ کررہے ہو، اپنے فرائض سے مجبور ہوکر کررہے ہو۔ لیکن میں تم سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا ایک ایسے نظام کو اخلاق اور قانون کی رو سے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جسے اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک شریف اور باعزت شہری کی ''خط وکتابت'' کی حُرمت، پاکیزگی اور تقدس پر ڈاکہ ڈالنا پڑے؟ جسے اپنے ملک کے ہر باشندے پر یہ شبہ ہو کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے یا چینی ایجنٹ۔ جسے فرد کی آزادی کا احترام نہ ہو اور جو اس کے پیدائشی حقوق

چھیننے کے لئے بے قرار ہو، اور جو موقع ملتے ہی ان پر جھپٹ پڑے۔ خط و کتابت کی آزادی ہر آزاد قوم کا مسلمہ حق ہے۔ انگریز نے اپنے زمانے میں ڈاک خانے کو عبادت گاہوں کی طرح ایک مقدس اور معزز ادارہ بنا دیا تھا۔ ہم وطنوں نے اس کا تقدس چھین کر اسے اپنے ذاتی تحفظ اور استحکام کا ذریعہ بنایا ہے۔ اب ڈاک خانے خطوط رسانی کا کام کم اور سراغ رسانی کا کام زیادہ کرتے ہیں۔

میرے ہم رازو! تم نے وہ سب خطوط پڑھے ہوں گے جو میری بیوی نے میرے نام لکھے تھے، (افسوس یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر خطوط تم نے مجھ تک پہنچنے ہی نہ دئے) تمہارے پاس وہ خطوط بھی محفوظ ہوں گے۔ جو میں نے اپنی بیوی کے نام لکھے تھے تمہیں اس بات کا تو یقین ہو گیا ہو گا کہ نئی نئی شادی کے بعد میاں بیوی چین اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں ایک دوسرے پر اپنا نقطہ نظر واضح نہیں کرتے۔ محبت اور پیار کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ میاں بیوی کی یہ عشقیہ شاعری پڑھ کر وزیر داخلہ محظوظ ہوا کرتے تھے یا خفیف! میری بیوی کو جب سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اس کے لکھے ہوئے خطوط مجھ تک پہنچنے کی بجائے "وزیر داخلہ" تک پہنچ گئے ہیں۔ تو ڈاک خانوں کے ساتھ ساتھ اس نظام پر سے بھی اس اس کا اعتبار اُٹھ گیا۔ جو اس قسم کی نکمی حکومتوں کو جنم دیتا ہے!

پچھلے دو سال سے میرے خطوط کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد تمہارے ذہن میں کچھ موہوم سے سوالات اُبھر آئے ہوں گے۔ تم یہ سوچ

رہے ہو گے کہ یہ چراغ بیگ کون ہے؟ اس کے خطوط میں بخشی غلام محمد کو کیا دلچسپی تھی۔ اور اب اس کے خطوط میں درگا پرشاد در کو کس اہم راز کی تلاش ہے؟ میں ان موہوم سے سوالات کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکتا۔ غالباً خود بخشی غلام محمد اور درگا پرشاد در بھی نہیں دے سکتے۔ اور ان سوالات کا جواب جان کر تم کرو گے بھی کیا؟ تمارا کام تو ان تمام خطوط کو کھول کر پڑھنا ہے۔ جن کے بارے میں تمہیں یہ شُبہ ہوا کر چراغ بیگ نے یا چراغ بیگ کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے اور کچھ واضح ہوا یا نہ ہوا۔ یہ صاف ہو گیا ہو گا کہ چراغ بیگ کا تعلق نہ چین سے ہے اور نہ پاکستان سے ...... وہ کسی تخریب پسند فرقہ پرست جماعت کا ممبر بھی نہیں۔ وہ موجودہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے کسی سازش میں بھی شریک نہیں۔ وہ کشمیر کو خود مختار بنانے والوں سے بھی بیزار ہے اور اسے پاکستان کے حوالے کرنے والوں کے خلاف بھی برسر پیکار ہے، وہ بم بنانے والوں کے کسی گروہ سے بھی تعلق نہیں رکھتا اس کے پاس کہیں سے پراسرار روپیہ بھی نہیں آتا لیکن اس کے باوجود اس کی ذاتی خط و کتابت پر حکومت وقت کی نگرانی ضروری سمجھی گئی ...... اس لئے کہ موجودہ دور میں مُلک کا وفادار ہونا ضروری نہیں ہے .... حکمرانوں کا وفادار، حکومتوں کا تابع دار اور وزارت داخلہ کا فرمان بردار ہونا ضروری ہے، اور میں بقول غالب ؂

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد
پر طبیعت ادھر نہیں جاتی

چراغ بیگ کو ایک اطمینان ہے کہ وہ اکیلا حکومت کی اس بداخلاقی اور بددیانتی کا شکار نہیں ریاست کے ہزاروں محبان وطن حکومت وقت کی اس عنایت کے سزاوار قرار پائے ہیں۔ میں نے جس سے بھی اس ناانصافی کی شکایت کی ۔

وہ مجھ سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے

دوستو! خطوط پڑھا کرو چٹخارے لے لے کر پڑھو۔ اپنے آقاؤں کو پڑھواؤ، لیکن ایک بات کر سکتے ہو؟ ان خطوط کی ایک نقل مکتوب الیہ کو بھی بھیجا کرو۔ تمہارا بڑا کرم ہوگا۔ فقط

تمہارا

چراغ بیگ

شمیم بنام بلراج پوری

پیارے بلراج!

معاف کرنا کہ تمہارے خط کا جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ بقول فیض ؎

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

غم دوراں سے ذرا سی فرصت ملی ہے، اور میں تمہارا قرضہ چکانے بیٹھا ہوں۔ خط کا جواب ذرا تلخ ہوگا۔ اس لئے پہلے دو ایک میٹھی میٹھی باتیں سن لو۔ میں تمہاری انگریزی تحریر کا بڑا عاشق ہوں (میری انگریزی کمزور ہے، اس کا خیال رکھنا) تمہارے اس خط نے مجھے تمہاری اُردو کا بھی قائل کر دیا ہے۔ بڑی خوبصورت اور رواں زبان لکھتے ہو۔ کبھی کبھی اُردو میں بھی لکھا کرو۔ ۷/اکتوبر کی اشاعت میں تمہارا شائع شدہ خط بہت پسند کیا گیا ہے۔ بعض دوستوں نے اس کی معقولیت، استدلال اور لہجے کی بڑی تعریف کی ہے۔ کچھ دیر کیلئے میں بھی اس بے روح ''معقولیت'' کے طلسم میں گرفتار رہا۔

تمہاری شخصیت اور تمہاری تحریر کی ایک بہت بڑی خوبی تمہاری انا

ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلسل ناکامیوں اور اپنے گردوپیش سے
بڑھتی ہوئی بے اطمینانی نے تمہاری انا کو اس درجہ مجروح کردیا ہے کہ یہ
تمہارے کردار کو توانائی بخشنے کی بجائے تمہاری کمزوری کی سب سے بڑی
علامت بن گئی۔ تمہارے اس طویل خط میں تمہاری ناآسودہ اور مجروح انا
نے کئی بار تمہیں اپنی ذات کو کائنات کا مرکز سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا کردیا۔ تم
نے شروع سے آخر تک میں کا استعمال کچھ اس اعتماد کے ساتھ کیا ہے کہ جیسے
''نیا کشمیر'' نہیں۔ تمہاری ذات موضوع بحث تھی میں بھی خودنمائی اور
خودستائی کیلئے بڑا بدنام ہوں۔ لیکن تمہاری حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور خود
مرکزیت کے مقابلے میں میری خودنمائی سراپا انکسار دکھائی دے گی۔

''یہ نہیں ہوگا'' کے متعلق تمہارا ردِ عمل ایک عام انسان کا نہیں، ایک
ایسے ریاض دان کا ہے جو زندگی کے ہر مسئلے حتیٰ کہ جنسی جذبات کو بھی حسابی
اصطلاحوں میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ جناب صادق صاحب
کی سرکار نے سارے کا سارا نیا کشمیر کتابوں سے حذف کرنے کا فیصلہ کیا ہے
میں کہتا ہوں ''یہ نہیں ہوگا۔'' ''یہ نہیں ہوسکتا'' ''ہم ایسا نہیں ہونے دیں
گے'' میرا تخاطب صرف ہندوستانی پارلیمنٹ سے ہی نہیں۔ ان تمام قوتوں
سے تھا جو ''نیا کشمیر'' کے نام سے چڑتے ہیں۔ جو ''نیا کشمیر'' کو درسی کتابوں
سے اس لئے خارج کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں کشمیر کی جدوجہد آزادی کی تاریخ
سے بغاوت علیحدہ پسندی، اور خودمختار کشمیر کی بو آتی ہے۔ تم یہ بھول گئے کہ

''یہ نہیں ہوگا'' دراصل پارلیمنٹ میں ریاست کی درسی کتابوں پر اس طوفانی ہنگامے کی صدائے بازگشت تھی۔ جو شری کاما متھ اور شری اشوک سین جیسے متوازن لیڈروں کو بھی ایک جذباتی سیلاب میں بہالے گیا تھا۔ تمہیں یاد ہے کہ لوک سبھا کے سپیکر جناب حکم سنگھ سے جب شری نندہ نے کہا تھا کہ ''نیا کشمیر'' کا ذکر صرف ایک تاریخی دستاویز کے طور پر درستی کتابوں میں موجود ہے۔ تو انہوں نے کیا جواب دیا تھا؟ تمہیں یاد ہے کہ نیا کشمیر کے نصابی کتابوں میں شامل ہونے پر بعض معزز ممبروں نے خواجہ غلام محمد صادق پر ''وطن دشمنانہ سازش'' میں شریک ہونے کا الزام لگایا تھا۔ تم یہ بھول گئے کہ شری نندہ اور وزیراعظم نے بدحواسی میں اس سارے مسئلے کے متعلق ایک انکوائری کرنے کا فیصلہ بھی کیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ تم میری جگہ ہوتے تو تمہارا ردِ عمل کیا ہوتا۔ تم چونکہ بڑے عقلیت پسند، بڑے متوازن اور بڑے سُلجھے ہوئے ریاضی دان ہو۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ تم اس سارے ہنگامے کو یوں ٹال جاتے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن میں ابھی تہذیب اور ریاضی کی اس سطح تک نہیں پہنچا ہوں، جہاں تم کھڑے ہو۔ اس لئے مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے صرف ہندوستانی پارلیمنٹ ہی نہیں۔ مقامی لیڈروں کو بھی متنبہ کیا کہ ''اگر ہماری موجودہ قیادت نے گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کر ہماری تاریخ کو مسخ کرنے، اس میں تحریف کرنے یا اسے مصلحتوں کی نذر کرنے کی کوئی کوشش کی تو ہم اس قیادت کے خلاف بغاوت کر کے اس کا تختہ اُلٹ دیں

گے۔" (آئینہ ۵ راگست) میں نیا کشمیر کو کوئی نا قابل تحریف یا ترمیم آسمانی صحیفہ نہیں سمجھتا اور یہاں بحث یہ نہیں ہے کہ "نیا کشمیر" پر عمل ہوا ہے یا نہیں، ہونا چاہئے یا نہیں بحث یہ ہے کہ کیا اسے ایک تاریخی دستاویز کے روپ میں ہماری نصابی کتابوں میں شامل رہنا چاہئے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ رہنا چاہئے اور ہر حال میں رہنا چاہئے۔ تم کہتے ہو کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ساری بحث کا ماحصل یہی ہے۔ تم "نیا کشمیر" کی سوگند کھانے والے موجودہ اور سابق حکمرانوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ انہوں نے اس کی کتنی سطروں پر عمل کیا ہے۔ ضرور پوچھو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن ان کے عمل کرنے نہ کرنے سے "نیا کشمیر" کی تاریخی اہمیت پر کیا اثر پڑے گا۔ تم الزام دیتے ہو کہ "عوامی راج کے پہلے سال کے بعد اس گرد آلوہ کتاب کا کسی نے ایک صفحہ بھی نہیں پلٹا" یہ الزام میرا بھی ہے۔ میں شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق اور سید میر قاسم سبھی کو مجرم سمجھتا ہوں۔ مگر اس سے "نیا کشمیر" کے نصابی کتابوں سے خارج کرنے کا جواز کہاں نکل آیا۔ تم اپنے استدلال میں اصل بحث اور اصل موضوع کو ہی بھول گئے۔ تمہیں شکایت ہے کہ "نیا کشمیر" کو ایک تاریخی اور مقدس دستاویز کے طور پر نصاب میں شامل کئے جانے پر اصرار کرنے والوں نے شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد اور تحریک آزادی کے دیگر سپہ سالاروں کا نام حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ میں کہتا ہوں "یہ نہیں ہوگا" میں تاریخ میں ہر قسم کی تحریف یا بددیانتی کے

خلاف ہوں تمہارے اندازِ فکر سے ایسا لگتا ہے کہ تاریخ کے تقدس کو برقرار رکھنے کی جنگ میں تم بھی میرے ساتھ ہو۔ لیکن اندازِ گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم بعض ان ممبران پارلیمنٹ کے حلیف ہو جو کشمیر کی جنگ آزادی اور نیا کشمیر کی تاریخی دستاویز کے نام سے بھی چڑتے ہیں۔ تمہارا یہ ذہنی تضاد تمہارے خط کے ایک ایک جملے سے واضح ہوتا ہے۔ تم نے معلوم نہیں یہ کیونکر فرض کر لیا میں صادق صاحب یا قاسم صاحب کی وکالت کرنے بیٹھا ہوں۔ تم نے بار بار ان کی کوتاہیوں اور غفلت شعاریوں کا جواب مجھ سے مانگا ہے۔ اس بارے میں ان کا موقف کیا ہے یہ تم ان سے پوچھو، میں تو اپنے نظریات، اپنی فکر اور اپنے استدلال کیلئے جوابدہ ہوں۔ تم نے اپنے خط میں کچھ اہم نظریاتی مسئلے بھی اُٹھائے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پر مفصل بحث ہو۔ لیکن وقت کی کمی اور ''آئینہ'' کی تنگ دامنی کا احساس دامن گیر ہے۔ اس لئے مختصر طور ان پر اظہار خیال کروں گا۔

تمہیں میرے اس بیان کی صحت اور صداقت پر شبہ ہے کہ اگر ہندوستانی رہنما نیا کشمیر کو ایک متروک تاریخی دستاویز قرار دے کر نظر انداز کر دیں تو ہندوستان اور کشمیر کے درمیان کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہتی۔ تم اس خیال سے بھی متفق نہیں ہو کہ اس دستاویز کو قابل اعتراض اور قابل تغریر قرار دینے والے ہندوستان اور کشمیر کے بنیادی تعلق ...... نظریاتی ہم آہنگی ...... کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تمہارا استدلال چونکہ بے حد

اہم اور دلچسپ ہے اس لئے میں اس کا ایک حصہ نقل کر رہا ہوں۔ تم نے لکھا ہے:

''نیا کشمیر'' کے بنیادی فلسفہ کو ماننے والے کشمیر میں بھی ہیں اور باقی ملک میں بھی۔ اسی طرح اس کو نہ ماننے والے راجہ جی اور ان کی پارٹی ''نیا کشمیر'' کے سوشلسٹ نظریے سے کلیتاً منحرف ہیں جبکہ کئی سوشلسٹ اور کمیونسٹ اس سوشلزم کو ناکافی اور اھورا سمجھ کر اس پر اعتقاد لانے سے گریز کریں گے۔ ''نیا کشمیر'' یقیناً مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کے زیادہ نزدیک تھا مگر کانگریس نے اسے کب قبول کیا۔ اور نہ نیشنل کانفرنس سارا کشمیر تھی۔ نہ کانگریس سارا ہندوستان۔ بہر حال اس سے بڑھ کر اور کوئی خود فریبی نہیں ہوسکتی، کہ کشمیر نے باقی ہندوستان سے ''نیا کشمیر'' کی شرط منوا کر الحاق کیا تھا۔ قانونی طور پر الحاق غیر مشروط تھا۔ مگر سیاسی اور اخلاقی سطح پر اس کی ایک ہی شرط تھی، کہ اس کی رائے شماری سے تصدیق کر لی جائے۔''

بظاہر اس استدلال میں بڑی معقولیت اور گہرائی ہے لیکن آؤ ذرا اس منطق کی تہہ میں جانے کی کوشش کریں۔ ہندوستان کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہوئی۔ کانگریس نے دو قوموں کی تھیوری کو نظریاتی طور پر تسلیم کیا یا نہیں، عملاً اس پر مہر تصدیق ثبت کر لی۔ ریاستوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کریں۔ حیدر آباد اور جونا گڑھ کے نوابین کی شدید خواہش کے باوجود یہ دونوں ریاستیں پاکستان کے ساتھ ملحق

نہ ہوسکیں۔ کیونکہ ان کی آبادی کی غالب اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔ اب اس پس منظر میں مجھے یہ بتائیے کہ کشمیر کو عام حالات میں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے تھا؟ میری رائے میں اگر کشمیر کے لوگ پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرتے تو اس سے کسی کو حیران یا پریشان ہونے کا موقع نہیں ملتا ۔کیونکہ تقسیم کی منطق اور تقسیم کے فوراً بعد رونما ہونے والے واقعات کا ایک ہی فطری انجام ہوسکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بن جائے لیکن میری ہی طرح آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا، شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں یہاں کی سب سے منظّم اور مقبول جماعت نیشنل کانفرنس نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کو نامنظور کردیا۔ بلکہ پاکستان کے خلاف تلوار اُٹھانے سے بھی گریز نہیں کیا۔

بلراج پوری صاحب ! آپ مجھے بتائیے کہ آپ کے نزدیک اس تاریخی فیصلے کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو مجھے یہ بھی بتائیے کہ آپ کے خیال میں اس فیصلے کے پیچھے کون سا ذہن، کون سی فکر، کون سی قوت اور کون سی قیادت کارفرما تھی۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا آپ اس جن سنگھی نظریے کو صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ کشمیر کا الحاق کشمیری عوام کی بجائے مہاراجہ بہادر کی سرداری کا ایک کرشمہ تھا۔ یا یہ کہ اسے کشمیری عوام کی مسلمہ قیادت کا اعتماد حاصل تھا۔ پہلی صورت میں مزید بحث بے کار ہے۔ لیکن اگر آپ میری ہی طرح ہند کشمیر الحاق کو ایک نظریاتی سمبندھ مانتے ہیں۔ تو مجھے یہ

بتائیے کہ اس الحاق کا نظریاتی مواد کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس سیاسی جماعت کا منشور ''نیا کشمیر'' ہو، وہ سیاسی جماعت کسی قسمت پر بھی پاکستان کے ساتھ الحاق پر آمادہ نہیں ہوسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار ترغیبات کے باوجود کشمیری لیڈروں نے پاکستان کے جھانسے میں آنے سے انکار کیا۔ آپ کہتے ہیں کہ ملک میں راجہ جی جیسے لوگ ''نیا کشمیر'' کو نہیں مانتے مگر ہم نے الحاق بھی تو راجہ جی اور ان جیسے لوگوں سے نہیں کیا تھا۔ ہماری مفاہمت تو جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد اور شریمتی گاندھی سے تھی جو نہ صرف ''نیا کشمیر'' کو مانتے تھے بلکہ اس کی بقأ کے لئے ہندوستان اور کشمیر کی وابستگی کو ضروری سمجھتے تھے۔ آپ کہتے ہیں کہ نیشنل کانفرنس سارا کشمیر نہ تھی اور نہ کانگریس سارا ہندوستان۔ یہ منطق کم از کم میری فہم سے بالاتر ہے۔ عظیم تاریخی فیصلے ملک کی ساری سیاسی جماعتوں کے اجتماعی فیصلے نہیں ہوتے۔ سب سے بڑی جماعت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے کانگریس ہندوستان کے چالیس کروڑ رہنے والوں میں سے فرداً فرداً ہر ہندوستانی کی نمائندہ جماعت نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن تقسیم کے فیصلے کو سارے ملک کو اس لئے ماننا پڑا کہ کانگریس تمام سیاسی جماعتوں میں سب سے زیادہ عظیم مقبول اور نمائندہ جماعت تھی۔ ملک میں وہ آج بھی ایسے لوگ اور سیاسی جماعتیں موجود ہیں جو تقسیم کے فیصلے کو صحیح نہیں مانتے اور جن کی خواہش ہے کہ ہندوستان کو ایک بار پھر متحد کردیا جائے۔ صرف ان کا وجود کانگریس کے تاریخی فیصلے کی تنسیخ کی

بنیاد نہیں بن سکتا اسی طرح نیشنل کانفرنس تھی ۱۹۴۷ء میں ریاست کی سب سے بڑی جاندار، منظّم اور نمائندہ تنظیم ''نیا کشمیر'' اس کا سیاسی منشور تھا اور اسی منشور کی روشنی میں نیشنل کانفرنس کی قیادت نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کیا۔ اب ۱۸ سال بعد آپ کو یاد آیا کہ نیا کشمیر تو صرف نیشنل کانفرنس کا سیاسی منشور تھا۔ اور نیشنل کانفرنس سارا کشمیر نہ تھی۔ سارا سے اگر آپ کی مراد ہر ''فرد واحد'' سے ہے تو آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ لیکن سیاسی زبان میں اکثریت کے فیصلے کو عوامی فیصلہ کہا جاتا ہے اور ان معنوں میں ''نیا کشمیر'' نیشنل کانفرنس ہی نہیں۔ اہلِ کشمیر کا سیاسی منشور تھا۔ اس موضوع پر اگلے خط میں مزید کچھ کہوں گا جب تک کے لئے اجازت دیجئے۔

فقط

تمہارا

شمیم

دوسری قسط

۱۹۶۶

شمیم بنام بلراج پوری

ڈیر بلراج!

پچھلے خط میں، میں نے ''نیا کشمیر'' اور ''ہند کشمیر الحاق'' کے باہمی تعلق کی اہمیت واضح کی تھی۔ میں ایک بار اپنے اس دعویٰ کو پھر دہراتا ہوں کہ اگر شری نندہ ''نیا کشمیر'' کو ایک متروک تاریخی دستاویز قرار دے کر نظر انداز کردیں، تو ہندوستان اور کشمیر کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں رہتی۔'' یہاں ''نیا کشمیر'' سے میری مراد صرف وہ تحریری دستاویز ہی نہیں۔ جس کے بعض حصے بدلے ہوئے حالات میں متروک نہیں۔ بلکہ غیر متعلق ہو گئے ہیں۔ بلکہ وہ اصول اور آدرش ہیں، جنکی خاطر کشمیری عوام نے نیشنل کانفرنس کے جھنڈے تلے جدوجہد کی اور جن کی رہنمائی میں ہم نے ہندوستان کے ساتھ اپنی تقدیر وابستہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ تم شاید اچھی طرح جانتے ہو کہ جو لوگ ''نیا کشمیر'' کو نہیں مانتے تھے۔ وہ ہندوستان سے الحاق پر بھی خوش نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ پاکستان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ اپنی ڈیڑھ انیٹ کی مسجد الگ بنانے کی فکر میں۔ اس وقت ہم نے ہندوستان

کے ساتھ الحاق کے لئے یہ جواز دیا تھا کہ ہماری قومی تحریک کا دھارا پاکستان کی بجائے ہندوستان کی تحریک آزادی سے ملتا ہے۔ آج یہ لوگ ہمیں طعنہ دے رہے ہیں کہ کیا ہوا تمہارا ''نیا کشمیر''! مجھے یہ بتاؤ کہ ہم ان لوگوں کے مُنہ کیونکر بند کرلیں۔

تُم نے پوچھا ہے کہ ''کیا کبھی جمہوری مُلک کی یکجہتی کی بنیاد کسی واحد کتاب، نظریہ، پارٹی یا لیڈر پر رکھی جاسکتی ہے؟ کون جانے کس ریاست میں کمیونسٹ سرکار بنتی ہے اور کہاں سوتنترا، مدراس میں دراوڑ کازگم برسراقتدار یا پنجاب میں اکالی، مگر نظریاتی اختلاف کی بناء پر کیا کسی ایسے حصے کو ملک سے الگ کردیا جائے گا؟ کسی بھی صورت میں ہندوستان کے بڑے سے بڑے لیڈر کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی علاقہ کو ملک کا حصہ رکھنے کے لئے کسی نظریہ پر پابندی کی ضمانت دے دیا اور ساری قوم کے ذہن کو گروی رکھ دے۔'' یہاں تم نے اپنا سارا زورِ خطابت صرف کردیا ہے اور بظاہر اس مسئلے پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن تمہیں شاید اس کا احساس نہ ہو کہ اس مرحلے پر تمہاری عقلیت اور تمہارا آئیڈ ملزم تمہیں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ تُم نے آگے چل کر اعتراف کرلیا ہے کہ بنیادی طور یہ لڑائی نظریاتی ہے۔ جغرافیائی نہیں...... '' اگر یہ لڑائی واقعی نظریاتی ہے تو پھر ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ تمہارا اور میرا نظریہ کیا ہے جن سنگھ جیسی فرقہ پرست جماعتیں ہندوستان کو ایک ہندو سٹیٹ بنانے پر مصر ہیں۔ کمیونسٹ اِسے چینی کمیونزم اور روسی سوشلزم کی بنیادوں پر ایک اشتراکی ملک بنانا چاہتے ہیں۔ سوتنترا

پارٹی اسے سرمایہ داروں کی جنت بنانا چاہتی ہے۔ کانگریس اشتراکی طرز کی نظام پر اس ملک کا مستقبل تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ ان متضاد اور متنوع نظریات کی کشمکش میں تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔ کہ تم کس کا ساتھ دو گے۔ اور جب تم یہ فیصلہ کر چکے ہو تو تمہیں اپنے آپ کو اور دُنیا کو یہ بتانا ہوگا کہ جن نظریات کو تم نے رد کیا ہے۔ ان میں کیا بُرائی ہے۔ اور جب کوئی جماعت عام انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آجائے تو وہ جماعت یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ ملک کی اکثریت نے اس کے سیاسی پروگرام کو قبول کیا ہے اور اقلیتی جماعتوں کو بھی اکثریتی جماعت کا یہ دعویٰ تسلیم کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ تم جاننا چاہتے ہو کہ کسی جمہوری ملک کی یکجہتی کی بنیاد کسی واحد کتاب، نظریہ پارٹی یا لیڈر پر رکھی جاسکتی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ ہاں رکھی جاتی رہی ہے اور رکھی جاسکتی ہے، اور اس کتاب کا نام جمہوریت ہے۔ جمہوری ملک میں ایک چھوٹی سی اقلیت جمہوریت کی دشمن اور اس نظام کی مخالفت پر کمر بستہ رہتی ہے۔ تمہارے استدلال کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ملک میں اس قسم کی ایک اقلیت موجود ہے۔ اس لئے وہاں جمہوری نظام کی برکتوں، اس کی خصوصیات اور اس کے فوائد کا حال نصابی کتابوں میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ جمہوری نظام کو فراڈ فراڈ اس ملک کا ہر شہری تسلیم نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر "نیا کشمیر" کو چونکہ پریم ناتھ بزاز اور بلراج پوری نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ لہٰذا اسے نصابی کتابوں میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے تمہاری اس منطق میں عجیب قسم کا تضاد نظر آرہا ہے ایسا لگ رہا ہے کہ تم بھی

ہندوستانی لیڈروں کے ان خود فریبانہ نعروں سے متاثر ہو گئے ہو کہ کشمیر ہندوستان کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح کیرالا، مدراس اور بنگال ہے۔ اسی لئے تم نے لکھا ہے ''مگر بار بار کشمیر اور ہندوستان کا دو الگ الگ اکائیوں کے طور پر ذکر کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ یا کشمیر ایک الگ ملک ہے یا ہندوستان کی آبادی، کبھی کسی نے یوپی اور ہندوستان کے رشتے کی بھی بات کی ہے؟'' افسوس کہ تم نے مجھ سے یہ سوال کرنے کی بجائے اپنے آپ سے نہ کیا میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ بہتر طور اس کا جواب دے سکتے ہو۔ میں کشمیر اور ہندوستان کے الحاق پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہوں، میں اس رشتے کو نا قابل تنسیخ سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں کشمیر کو کیرالہ پنجاب ، مدراس اور بنگال کی سطح پر نہیں لاسکتا۔ تم اور میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ کشمیر ہندوستان کی ایک ریاست ہونے کے باوجود بھی باقی ریاستوں سے مختلف ہے کیرالہ، مدراس، پنجاب اور بنگال اس لئے ہندوستان کا ایک حصہ ہیں کہ یہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ کشمیر'' آج ہندوستان کا حصہ ضرور ہے ۔لیکن کشمیر چاہتا تو یہ اس کا حصہ نہیں بھی رہ سکتا تھا۔ کیرالہ، مدراس اور پنجاب کے لوگوں کے پاس کون سی مرضی (Choice) تھی ؟ کشمیر کے پاس ایک مرضی (Choice) تھی اور اس کے بعد اس نے ہندوستان سے الحاق کیا، اسی ''حقِ انتخاب'' نے کشمیر کو ہندوستان کی دیگر ریاستون سے اگر ممتاز نہیں تو مختلف ضرور بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کو دفعہ ۳۷۰ کی چھتر چھایا حاصل ہے اور مدراس اس سے محروم ہے۔ تم اتفاق کرتے ہو کہ بنیادی طور پر یہ لڑائی

نظریاتی ہے جغرافیائی نہیں" لیکن اس کے بعد جب میں اپنے (نظریات) کی سلامتی کے لئے جنگ کا اعلان کرتا ہوں ۔ تو تم کشمیر کی جغرافیائی حیثیت پر زور دینا شروع کرتے ہو۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور آج پھر کہتا ہوں کہ کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ نہیں ہندوستان کے سیکولرازم کے ساتھ الحاق کیا ہے اور اگر ہندوستان میں جن سنگھ جیسی رجعت پسند جماعت برسراقتدار آئی تو ہم اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے کا حق مانگیں گے۔ میرے نزدیک اس الحاق کی بنیاد صرف ایک نظرے پر قائم تھی ۔ اور وہ نظریہ تھا سیکولر جمہوریت کا ۔ میں صرف جمہوریت سے ہی مطمئن نہ ہوں گا۔ جب تک کہ اس جمہوریت کا کردار سیکولر نہ ہو۔ اگر جنوبی ہندوستان صرف ہندی کو سرکاری زبان بنائے جانے کے خلاف احتجاج کے طور پر الگ ہونے کی دھمکی دے سکتا ہے تو مجھے بھی یہ حق دو کہ میں اس ہندوستان سے الگ ہونے کی فکر کروں ۔ جہاں فرقہ پرستی ، تنگ نظری اور مذہبی تعصب کے برسرِ اقتدار آنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے خط پھر طویل ہوتا جا رہا ہے "آئینہ" کے ان صفحات پر صرف تمہارا اور میرا ہی استحقاق نہیں ۔ اس لئے بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کا جواب دیئے بغیر اس کو یہیں پر ختم کرتا ہوں ۔

فقط

تمہارا

شمیم

ماں بیٹی خط و کتابت

بیٹی کے نام

ماں کا خط

میری پیاری لختِ جگر! بھگوان جانتا ہے کہ میرا یہ خط تم تک پہنچ بھی پائے گا یا نہیں، کیونکہ تمہارے ماموں کا خیال ہے کہ تم ایک تنگ و تاریک کمرے میں محبوس ہو، اور تم سے ملنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ معلوم نہیں کہ مجھے اس بات کا یقین کیوں نہیں آ رہا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے تم بالکل آزاد ہو اور یہ خط تم تک ضرور پہنچ جائے گا۔ نہ بھی پہنچے تو مجھے اس کا دُکھ نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ خط صرف تمہارے ہی نام نہیں ہر اُس بیٹی کے نام ہے جو تمہاری ہی طرح ماں کی آغوش سے نکل کر کسی نئے آغوش کی تلاش میں جانے کیلئے بے قرار ہے تمہاری شادی سے اِس شہر ہی میں نہیں، سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہوا ہے۔ تمہارے ہم مذہبوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا ہے اور پچھلے دو ماہ سے شہر کی کیفیت ہی بدل گئی ہے۔ دو تین نوجوان پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہو کر موت کی نیند سو چکے ہیں۔ سینکڑوں بوڑھے اور نوجوان جیل یاترا کر کے لوٹے ہیں۔ پولیس اور فوج نے اہلِ شہر کی خوب مرمت کی ہے۔ تمہارے نام پر پنڈتوں اور مسلمانوں میں بہت سے نئے لیڈر وجود میں آ گئے ہیں۔ دِلّی سے سرینگر تک ایک ہل چل مچی ہوئی ہے۔ وزیر داخلہ مسٹر

چوان بھی تشریف لائے تھے۔ شریمتی اندرا جی کے آنے کی بھی افواہ تھی۔ شاید وہ بھی آجائیں۔ غرض تم نے غلام رسول سے شادی کیا کی، جذبات کے سوئے ہوئے سمندر میں طوفان اور تلاطم کی وہ لہریں پیدا کردیں کہ سینکڑوں برسوں کی روایات کا محل دھڑام سے گر گیا۔

میری بیٹی! مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ تمہاری وجہ سے خواہ مخواہ اتنا بڑا ہنگامہ پیدا ہوا ہے، میں جانتی ہوں کہ تمہیں بھی یہ جان کر بے حد تکلیف ہوئی ہوگی کہ تمہارے نام پر لاٹھی چارج ہوئے ہیں یا خون بہا ہے۔ میں نے اپنے پنڈت بھائیوں سے کہا تھا کہ اس بات پر ایجی ٹیشن کرنا مناسب نہیں۔ لیکن نیتا لوگوں نے میری ایک نہ سُنی۔ انہوں نے کہا کہ ایسا موقعہ پھر شاید کبھی نہ ملے۔ اِس لئے ایجی ٹیشن کرنا بہت ضروری ہے۔ میں نے صرف اس وقت رضا مندی ظاہر کی جب ایک نیتا جی نے مجھے یہ بھروسہ دِلایا کہ ایجی ٹیشن کرنے سے تم اپنے گھر آسکتی ہو۔ ایجی ٹیشن ختم ہوگئی ہے اور تم اب بھی مجھ سے دُور ہو۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ نیتا لوگوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ تم شاید اب کبھی نہ آؤ گی۔

میری بیٹی! برادری نے تمہاری شادی اور اِسلام قبول کرنے کے ساتھ اتنے سارے مسائل وابستہ کردیئے کہ ایک ماں کو اپنے دل کی بات سنانے کا موقع ہی نہیں مِلا۔ نیتاؤں نے ملازمت اور کالجوں میں داخلے کے مسئلے کو بھی تمہاری شادی سے نتھی کردیا اور نتیجہ یہ کہ میں تم تک اپنی بات پہنچانے کیلئے تڑپتی ہی رہی۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے لئے نوکری اور داخلے کی

بات بالکل بے معنی ہے۔ تمہیں ملازمت مِل چُکی ہے۔ میں ملازمت کر رہی ہوں۔ تمہارے میرے سِوا، گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔ جس کی نوکری یا داخلے کا ہمیں کوئی فکر ہو۔ لیکن اس کے باوجود تم ساری برادری کی نوکری اور داخلے کا عنوان بن گئیں۔ اب ایجی ٹیشن ختم ہوگئی ہے۔ لوگ رفتہ رفتہ تمہیں بھلائے جا رہے ہیں۔ نیتا لوگ بہت اُونچی سیاست میں اُلجھ گئے ہیں۔ انہیں اب تمہارے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اب ایک ماں اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔

پیاری پرمو! تمہیں شاید معلوم ہو کہ تمہاری پیدائش کے کچھ دِن بعد ہی تمہارے پتا جی سرگباشی ہو گئے تھے اور میں نے اپنی راتوں کی نیند اپنے دن کا چین اور اپنی جوانی کا لہو پلا پلا کر تمہیں پالا پوسا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب تم چار سال کی تھیں تو تم سخت بیمار ہوگئی تھیں، ڈاکٹروں نے کہا کہ نمونیہ ہوگیا ہے۔ اور بچنے کی اُمید کم ہے۔ میں نے پُورے سات دِن تمہیں اپنی آغوش میں یوں چمٹا کر رکھا کہ اگر موت آئی بھی تو میں تمہیں دینے سے انکار کرتی۔ شاید اِسی لئے موت کو تمہارے قریب پھٹکنے کی ہمت بھی نہ پڑی۔ تم اسکول میں داخل ہوگئیں تو میری ساری کائنات کا محور بدل گیا۔ تمہارے بغیر میرا گھر سونا سونا لگتا اور جب تک تم اسکول سے لوٹ آتیں۔ میری نظریں دروازے پر ٹکی رہتیں۔ تمہیں اس بات کا بھی اعتراف ہوگا کہ جب تک تم سکول میں پڑھتی رہی میں نے تمہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ تم ایک بیوہ ماں کی بے سہارا لڑکی ہو۔ قرض اُٹھا کر، دن رات محنت کر کے میں نے

تمہارے تعلیمی اخراجات برداشت کیئے۔ تمہاری سہیلیوں کو اِس بات کا احساس نہ ہونے دیا کہ تم اِن کے مقابلے میں غریب ہو۔ تمہارے لئے اچھے اچھے کپڑے بنائے، خود بھوکی رہ کر تمہیں اچھے سے اچھا کھانے کو دیا۔ میں خود سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ مگر تمہاری تندرستی دیکھ کر میں اپنے سارے دُکھ درد بھول جاتی تھی۔ تم نے نوجوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا تو مجھے تمہاری شادی کی فکر ہوئی۔ ہمارے سماج میں لڑکی کی شادی کتنی کٹھن اور مہنگی ہوتی ہے۔ اس کا شاید تمہیں اندازہ ہو۔ میں نے پائی پائی بچا کر تمہارے لئے کچھ اثاثہ تیار کر ہی لیا۔ مجھے سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے صرف تمہاری شادی کی فکر دامن گیر تھی۔ میری خواہش تھی کہ تمہیں ایک اچھا پتی ملے۔ ایک اچھا گھر ملے اور میں تمہیں شادو آباد دیکھ کر زندگی کے باقی دن گزاروں۔ میں یہ سب باتیں دُہرا کر تمہیں اپنے احسانات کی یاد نہیں دِلانا چاہتی۔ جو کچھ میں نے کیا دُنیا کی ہر ماں یہی کرتی ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مائیں اپنی بیٹیوں کی خاطر کیا کرتی ہیں اور تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اپنی ماں کی خاطر کیا کیا؟ ذات برادری کے لوگوں نے تمہیں اپنی سیاسی دکان چمکانے کیلیئے استعمال کیا۔ لیکن میں ماں ہونے کے ناطے تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میرا ابھی تم پر کوئی حق ہے یا نہیں؟ یہ بھول جاؤ کہ تم بالغ ہو یا نابالغ۔ یہ بھی بھول جاؤ کہ تم مسلمان ہو یا ہندو، یہ بھی بھول جاؤ کہ تمہارے نام پر شہر میں دنگا فساد ہوا ہے۔ صرف یہ یاد رکھو کہ تم ایک بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی ہو۔ وہ ماں جس نے تمہیں ساری دُنیا کی نظریں بچا کر جوان کیا تھا۔ اور

تمہارے مستقبل کیلئے خوبصورت گھروندے بنائے تھے۔ وہی ماں یہ جاننا چاہتی ہے کہ جب تم نے گھر کی چار دیواری سے قدم باہر رکھا۔ تو کیا تم نے یہ بھی سوچا کہ تمہاری ماں پر کیا گزرے گی۔ ایک لمحے کے لئے تمہیں یہ بھی خیال آیا کہ اس ماں کے ارمانوں پر کیا گزرے گی۔ جس نے اپنی زندگی کے بہترین سال تمہاری پرورش میں گزارے ہیں۔ بدقسمتی سے تمہاری شادی کے مسئلے کو یہاں کے لوگوں نے ہندو اور مسلمان کا مسئلہ بنا دیا۔ لیکن میں تو یہ جانتی ہوں کہ ہندو یا مسلمان تو تم بعد میں ہو گئیں۔ تم سب سے پہلے میری بیٹی ہو، یہ بتاؤ کہ اگر ہر بیٹی اپنی ماں کے ساتھ یہی سلوک کرے۔ جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے۔ تو ماں بیٹی کا پیار، ان کے رشتے کا تقدس کیسے برقرار رہے گا۔ اس وقت مسلمان تمہیں اسلام کی برتری اور ہندو تمہیں دھرم کی حفاظت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے اصلی مسئلہ پسِ منظر میں چلا گیا ہے۔
میرے نزدیک ہندو اور مسلمان دونوں کیلئے مسئلہ یہ ہے کہ لڑکیوں کو والدین کی مرضی کے بغیر شادی کا اخلاقی حق حاصل ہے یا نہیں؟ کیا لڑکیوں کی شادی میں صرف اُنکی اپنی مرضی کا دخل ہونا چاہیئے یا ماں باپ کے مشورے کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے۔ جذبات کی رَو میں بہہ کر ہندو اور مسلمان اِسے خالص سیاسی مسئلہ اور بعض لوگ مذہبی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن میں جب ایک ماں کے نکتہ نظر سے سوچتی ہوں تو میرے لئے تمہارے ہندو رہنے یا مسلمان ہونے کا مسئلہ بالکل غیر مطلق ہے۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تمہاری ماں ہونے کے ناطے میرا بھی تم پر کچھ حق تھا۔ جس کے

بارے میں تم نے کچھ نہیں سوچا۔ تم جذبات کی ترنگ میں ماں کی مامتا اور بیٹی کی سعادت مندی کو بھی بھول گئیں۔ اور مجھے تم سے یہی شکوہ ہے۔ تم اب مسلمان ہو گئی ہو اور میں نہیں جانتی کہ اسلام میں ماں کا کیا درجہ ہے اور ماں اور بیٹی کے تعلقات کی کیا حدیں مقرر ہیں۔ میرے پڑوس میں جو مسلمان عورت رہتی ہے وہ کہتی تھی کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے کہا ہے کہ تمہیں اگر جنت کی تلاش ہو تو اپنی ماں کے پیروں تلے تلاش کرو۔ لیکن تم نے اپنی ماں کی محبت کو اپنے پیروں تلے روند کر اپنی جنت بسالی ہے اور اگر میری پڑوسن ٹھیک کہتی ہے تو تم سچے معنوں میں مسلمان بھی نہیں مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے کہ تم پر اس خط کا کوئی اثر ہو گا لیکن میں دنیا بھر کی ماؤں سے جن میں مسلمان مائیں بھی شامل ہیں اور ہندو مائیں بھی یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کی بیٹیاں بھی وہی راستہ اختیار کریں جو میری بیٹی نے کیا ہے تو اُن کا ردِعمل کیا ہو گا......؟ میں جانتی ہوں کہ میں پرانے خیالات کی ایک بیوہ ہوں اور نئے زمانے کے تقاضوں کا مجھے صحیح احساس نہیں لیکن جس طرح جوانی کے کچھ قوانین ہوتے ہیں۔ مامتا کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ میرا یہ خط اس تقاضے کی پیداوار ہے۔

بھگوان تمہیں ہر حال میں خوش رکھے اور تمہیں ایک چاند سی لڑکی عطا کرے۔

فقط

تمہاری بیوہ ماں

آئینہ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۷

بیٹی کا خط ...... ماں کے نام

ماتا جی!

آپ کا خط ملا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ رسوم و قیود، نفرت اور بیگانگی کی مصنوعی دیواروں کی ڈھاتی ہوئی آپ خود میرے پاس آ گئی ہیں، آپ کی آنکھیں پہلے ہی کی طرح روشن تھیں مگر آپ کے چہرے پر جھریوں کے آثار نظر آئے۔ یہ پُرانی ساڑھی جسے پہنتے ہوئے اب آپ کو کئی سال ہو گئے۔ اب بالکل پھٹ چکی ہے۔ حیرت ہے کہ ماموں جان نے ابھی تک آپ کو نئی ساڑھی لا کر نہیں دی ہے آج پہلی بار میرے گھر آئی تھی تو مجھے آپ کی راہ میں اپنی آنکھوں کا فرش بچھانا چاہئے تھا۔ مگر آپ کا آنا، اس قدر غیر متوقع تھا کہ آپ کو سامنے دیکھ کر میں حیرت سے دیکھتی رہی۔ لیکن یقین جانئے کہ آپ کے جانے کے بعد میں بہت دُور تک اِس راہ پر اپنی آنکھوں کے موتی نثار کرتی رہی۔ جس پر آپ کے پوتر قدموں کے نشان پڑھے تھے۔ ماں نے بیٹی کے سامنے اپنا دِل کھول کر رکھ دیا ہے تو بیٹی کو بھی اجازت دیجئے کہ ماں کو اپنا کلیجہ چیر کر دکھائے۔

...... ماں! آپ کے خط کا ایک ایک لفظ ایک تیز نشتر کی طرح میرے سینے کو چھلنی کر گیا ہے۔ یہ دو ماہ کی ایجی ٹیشن جس میں کچھ لوگ مارے گئے اور

بقول آپ کے سینکڑوں بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو جیل یاترا بھی کرنا پڑی ۔میرے لئے ایک غیر متعلق شوروغل اور ہنگامے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ۔لیکن آپ کے خط نے کچھ ایسے جذبات کو بیدار کر دیا ہے کہ جن کو میں نے تھپکیاں دے دے کر سُلایا تھا۔آپ نے مذہب اور سیاست کا لبادہ اُتار کر ماتا اور محبت کی بات کی ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ دور بہت دور سے، کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہے، نفرت عداوت اور فساد کے اِس ماحول میں آپ کی آواز سن کر مجھے میری منزل مِل گئی ہے دھرم، مذہب، وقار، حقوق، نوکری اور اس طرح کے شوروغل میں ایک بیٹی اپنی ماں سے بہت دور نِکل چکی ہے۔آپ نے اچھا کیا کہ ذات برادری اور نیتاؤں کے چکر سے نکل کر اپنی بیٹی کو، پرموکہہ کر آواز دی، بات دراصل یہ ہے کہ اِس سارے مُقدّمے میں صرف ماں اور بیٹی ہی فریق بن سکتے تھے۔لیکن جیسا کہ آپ نے کہا ہے دھرم اور برادری کے ٹھیکیداروں نے اپنے حقوق اور نوکریوں کے لئے ایک بیوہ ماں کی اکلوتی لڑکی کا سودا کرنا چاہا اور سودے بازی میں کچھ جانیں تلف ہوگئیں، کچھ مکان جل گئے اور کچھ دکانیں لُٹ گئیں۔

ماتا جی! آپ نے کچھ پرانی یادیں تازہ کر کے صرف اپنے آپ پر ہی نہیں۔مجھ پر بھی بے حد ظلم کیا ہے اِن دنوں کا تعلق اِن دنوں سے ہے جب ہم ماں بیٹیاں ایک تنگ و تاریک کمرے میں زندگی کی قبا میں پیوند لگایا کرتی تھیں، جب آپ گھر کے کام کاج سے فرصت پا کر میرے بال سنوارا کرتی تھیں، اور میں ہر شام آپ کے پیر دبا کر آپ کی طرف دادطلب نگاہوں سے

دیکھا کرتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم جس لحاف تلے سوتے تھے۔ وہ کئی جگہ تار تار ہو چکا تھا۔ اور آپ ہر شام اِس میں ایک نیا پیوند لگایا کرتی تھیں۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ میں نے آپ سے یہ معصوم سا سوال کیا تھا کہ اِس دنیا میں ہمارا کون ہے۔ تو آپ نے گلوگیر آواز میں جواب دیا تھا، بھگوان! پھر جب آپ نے نوکری کی تلاش شروع کر دی اور آپ کو نوکری مِل گئی تو آپ نے یہی کہا تھا کہ بھگوان کی کرپا سے مجھے نوکری مل گئی۔ جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی، میرے اندر یہ احساس بھی جوان ہوتا رہا کہ اس وسیع دنیا میں بھگوان کے سِوا ہمارا کوئی نہیں۔ آپ کہتی ہیں کہ میں نے کبھی تمہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ تم ایک بیوہ ماں کی ایک بے سہارا لڑکی ہو۔ میں کہتی ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہے مجھے اپنی بے چارگی کا اس قدر احساس تھا کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتی۔ اس لئے آپ کے منع کرنے کے باوجود میں نے تعلیم چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی ہے۔ میں آپ کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے خوابوں کی دنیا تعمیر کرنے سے پہلے ہی اسے مسمار کر دیا۔ انتہائی بے کسی اور شدید تنہائی کے احساس نے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا اور میں اپنے آپ کو دنیا کی حقیر ترین لڑکی سمجھنے لگی۔ ایک یتیم لڑکی، جس کا اس دنیا میں ایک بیوہ ماں کے سِوا کوئی نہ تھا بدقسمتی سے میں ایک ایسے سٹور میں ملازم تھی۔ جہاں گاہک ٹھوک بجا کر ہر چیز خرید تے تھے۔ ایک دِن میں اپنے بارے میں سوچنے لگی کہ اس دنیا کے بازار میں میری کیا قیمت ہے؟

"یہ روپیہ کھوٹا ہے۔ دوسرا دیجئے" ساتھ والے کاؤنٹر پر ایک سیل گرل نے

ایک گاہک کو کھوٹا روپیہ واپس دیتے ہوئے کہا۔ اور میں جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سوال کا جواب بھی یہی تھا۔ میں ایک کھوٹا روپیہ ہوں۔ جس کی کوئی قیمت نہیں، انہی دنوں کی بات ہے کہ سٹور میں کام کرنے والا ایک بھولا بھالا سا نوجوان لڑکا، خود بخود میری آنکھوں میں سمانے لگا۔

ماتا جی! لمحہ بھر کے لئے غصہ تھوک دیجئے اور میری داستان کو ایک ماں کے نقطہ نظر سے نہیں۔ ایک نوجوان لڑکی کی نفسیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے، جس دور سے میں گزر رہی ہوں، اس دور سے آپ ہی نہیں، دنیا کی ہر ماں ضرور گزری ہوگی۔ عمر کی اِس منزل میں نوجوان لڑکی کی دُنیا میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں ایک خلش۔ اس کے جذبات میں ایک طوفان اور اس کی آنکھوں میں کچھ سوال پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کچھ لمحوں کے لئے اپنا افلاس اپنا مرتب، اپنی غربت اور اپنی مجبوریوں کو بھول کر اپنے آپ کو مرکز کائنات سمجھنے لگتی ہے۔ آپ اگر اپنے حافظے پر زور دیکر صرف بیس سال پیچھے کی طرف دیکھ لیں تو آپ پر ان باتوں کی معنونیت اور اس فسانے کی حقیقت آشکارا ہوگی۔ آپ اعتراف کریں گی کہ میری عمر کی ہر لڑکی اس نفسیاتی تغیر سے گذرتی ہے۔ اور سٹور کے اس بھولے بھالے ملازم سے میری دلچسپی کا آغاز اس تغیر کی یادگار ہے۔ رفتہ رفتہ میری تنہائی کا احساس مٹنے لگا۔ بے چارگی اور بے کسی کا تاثر مدہم پڑنے لگا، میرے احساس کمتری میں ایک نمایاں کمی واقع ہونے لگی اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ

یہ دنیا اتنی بدصورت بھی نہیں جتنی مجھے نظر آ رہی تھی مجھے اِس وقت یہ معلوم بھی نہ تھا کہ میں اس بھولے بھولے نوجوان سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اس لئے میں نے نہ اس کا نام پوچھا اور نہ ہی مذہب...... دِن گذرتے گئے۔ اور مجھے دنیا حسین سے حسین تر نظر آنے لگی۔

ماتا جی! کیا دنیا کی کوئی عورت، کوئی لڑکی اِس بات کا دعویٰ کر سکتی ہے؟ کہ وہ اس نازک جذباتی دور سے نہیں گذری ہے؟ کیا یہ واقع نہیں کی میری حماقت سے پہلے بھی کئی لڑکیاں اس جرم کی مرتکب ہو چکی ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دھرم اور برادری کے بہت سے ٹھیکیداروں نے ایسے مجرموں کو آشیرواد بھی دی ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ جب ایک بیوہ ماں کی اکلوتی لڑکی بھی اس حماقت کو دہراتی ہے تو ذات، برادری اور دھرم کے نام پر ایک طوفان بپا کیا جاتا ہے۔ آپ سے تو یہ کہہ کر معافی مانگ لوں گی کہ آپ کی بیٹی نے آپ کی صحبت پر اعتماد کر کے یہ جرم کیا ہے۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ آپ میری بڑی سی بڑی خطا بھی معاف کر سکتی ہیں۔ میں جانتی تھی کہ میں نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا قدم اُٹھایا۔ جو غالباً مجھے نہیں اُٹھانا چاہیئے تھا لیکن مجھے یہ بتائیے کہ برادری کے نام پر ہنگامہ کرنے والوں کو ہمارے ذاتی معاملات میں دخل ہونے کا کیا حق ہے؟ مجھے برادری نے نہیں آپ نے پال کر جوان کر دیا ہے۔ مجھے دھرم کے ٹھیکیداروں نے نہیں۔ آپ نے تعلیم دلائی ہے۔ مجھے ہندو دھرم کے نام پر اقتدار حاصل کرنے والوں نے نہیں، آپ نے نوکری دلائی تھی۔ یہ برادری، ذات اور دھرم کے پجاری اس

وقت کہاں تھے۔ جب آپ اس پھٹے ہوئے لحاف میں پیوند لگایا کرتی تھیں ۔میری شادی کے فوراً بعد آپ کے اور میرے اتنے دعویدار کیسے پیدا ہو گئے اور ہاں میں ان دھرماتماؤں سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ۲۸ جولائی سے قبل تم میں سے کتنے، نیتا ایسے تھے جو اپنے بیٹوں کو ایک بیوہ کی اکلوتی لڑکی سے بیاہنے کیلئے تیار تھے؟

ماتاجی! میں نے آپ کو بڑی تکلیف پہنچائی ہے۔ اس کا مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔ آپ نے میری پرورش کی ۔ دُکھ درد جھیل کر مجھے جوان کردیا۔ آپ کا احسان میں زندگی بھر نہ چکا سکوں گی۔ لیکن ایک بات میں بھی کہنا چاہتی ہوں کیا ایک بیٹی اپنی ماں سے کسی چیز کی توقع نہیں رکھ سکتی ہے۔ ہر ماں، ماں بننے سے پہلے ایک بیٹی ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ لمحہ بھر کیلئے بیٹی بن کر میری گستاخی پر نظر ڈالیں، دنیا میں کتنی ہی بیٹیاں ہوں گی۔ جنھوں نے وہی حرکت کی ہوگی۔ جو میں نے کی، لیکن وہ کتنی مائیں ہوں گی جنھوں نے اپنی بیٹیوں کو پولیس اور عدالت کی زینت بنانے کی جسارت کی ہو۔ آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے مسلمان ہوگئی اور میں نے بغیر کسی جبر یا فریب کے اس بھولے بھالے نوجوان سے شادی کی جو بد قسمتی سے میرا ہم مذہب نہیں ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے یہ جھوٹ بولا کہ مجھے ورغلا کر حبسِ بیجا میں رکھا گیا ہے آپ نے خودغرض لیڈروں کے جھانسے میں آکر میرے نابالغ ہونے کا جھگڑا اُٹھایا۔ اس کا حتمی فیصلہ عدالت کرے گی۔ کہ میں بالغ ہوں یا نابالغ ...... لیکن مجھے بتایئے کہ

آپ کی مامتا نے یہ کیسے گوارا کرلیا کہ آپ کی بیٹی پولیس تھانوں اور عدالت کے کچہروں کی رونق بنے۔ مجھے اس بات کا شاید افسوس ہے کہ میری وجہ سے ریاست کا امن وامان درہم برہم ہو گیا ہے اور صدیوں کی محبت و رواداری میں فرق آگیا ہے۔ لیکن آپ نے بیٹی کی غلطی کے لئے اس سے انتقام لینے کی ایک طرح ڈالی ہے اور مامتا کی تاریخ میں ایسی مثال ملنا ممکن نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ اور اس طرح انہیں ان کے مستقبل کے متعلق سوچنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ جوان بچوں کو بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل رہتا ہے اور زمانہ جس ڈگر پر جارہا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو حق خود ارادیت حاصل ہوگا۔ میں نے وہی کیا ہے جو اس سے پہلے میری بہت سی بہنیں کرچکی ہیں۔ اور جو کچھ دنوں بعد ہر لڑکی کرے گی۔ اس لئے آپ کی ناراضگی تو سمجھ میں آسکتی ہے مگر آپ کا جذبۂ انتقام ناقابل فہم ہے۔ آپ نے مسلمان ماؤں سے پوچھا ہے کہ اگر انکی بیٹیاں بھی وہی راستہ اختیار کریں۔ جو آپ کی بیٹی نے کیا ہے تو ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ مسلمان مائیں آپ کو میری معرفت یہ جواب دینا چاہتی ہیں کہ آپ کا سوال ہی نہیں، بہت سی بیٹیاں ایسا کرچکی ہیں بعض اوقات اپنی ماؤں کا دل دُکھا کر کسی غیر کے ساتھ گئی ہیں۔ ان ماؤں پر غم والم کے پہاڑ ٹوٹے۔ لیکن ان میں سے کسی ماں نے آج تک پولیس اور عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ ان ماؤں نے اپنی بیٹیوں کی خوشی کی خاطر اپنا وقار اور اپنی ہر خوشی قربان کردی مگر بیٹی کی عزت

پر حرف نہیں آنے دیا۔ اِن کا ردِ عمل وہی رہا ہے جو آپ کا تھا۔ لیکن انہوں نے کبھی وہ نہیں کیا۔ جو ذات برادری کے ٹھیکیداروں نے آپ سے کرایا۔

جہاں تک میرے ہندو یا مسلمان ہونے کا سوال ہے میں آپ کی بیٹی ہونے کے ناطے آپ سے ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ جب سے میں نے محبت کا مذہب اختیار کیا ہے۔ میرے لئے اسلام، ہندو دھرم یا کسی اور دھرم کی کوئی تحقیق باقی نہیں رہی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کرنے والا دھرم سے بہت اونچا اُٹھ جاتا ہے۔ اس لئے میں ہندو بھائیوں سے گذارش کروں گی کہ وہ دھرم کے نام پر میرے لئے چنتا کرنا چھوڑیں اور مسلمان بھائیوں سے التماس کروں گی کہ وہ مجھے اسلام کی عظمت کا نشان سمجھ کر میرے لئے مرنے مارنے پر تیار نہ ہو جائیں۔ ہاں میں ملک کے قانون سے درخواست کرتی ہوں کہ اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو مجھے اس کی سزا دی جائے اور اگر میں نے صرف اپنے بنیادی حقوق کا استعمال کیا ہے تو میری حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ آپ سب سے پہلے میری ماں ہیں اور اس کے بعد نیتا، زندہ باد کے نعروں کی گونج میں یہ نہیں بھولئے کہ پرمو آپ کی بیٹی ہے

بھگوان آپ کو ہر حال میں سکھی رکھے۔ آپ کے خط کا انتظار رہیگا۔

فقط

آپ کی نافرمان بیٹی

آپ کی مامتا نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ آپ کی بیٹی پولیس تھانوں اور عدالت کے کچہروں کی رونق بنے۔ مجھے اس بات کا شاید افسوس ہے کہ میری وجہ سے ریاست کا امن و امان درہم برہم ہو گیا ہے اور صدیوں کی محبت و رواداری میں فرق آ گیا ہے۔ لیکن آپ نے بیٹی کی غلطی کے لئے اس سے انتقام لینے کی ایک طرح ڈالی ہے اور مامتا کی تاریخ میں ایسی مثال ملنا ممکن نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ اور اس طرح انہیں ان کے مستقبل کے متعلق سوچنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ جوان بچوں کو بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل رہتا ہے اور زمانہ جس ڈگر پر جا رہا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو حق خود ارادیت حاصل ہو گا۔ میں نے وہی کیا ہے جو اس سے پہلے میری بہت سی بہنیں کر چکی ہیں۔ اور جو کچھ دنوں بعد ہر لڑکی کرے گی۔ اس لئے آپ کی ناراضگی تو سمجھ میں آ سکتی ہے مگر آپ کا جذبۂ انتقام ناقابل فہم ہے۔ آپ نے مسلمان ماؤں سے پوچھا ہے کہ اگر انکی بیٹیاں بھی وہی راستہ اختیار کریں۔ جو آپ کی بیٹی نے کیا ہے تو ان کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ مسلمان مائیں آپ کو میری معرفت یہ جواب دینا چاہتی ہیں کہ آپ کا سوال ہی نہیں، بہت سی بیٹیاں ایسا کر چکی ہیں بعض اوقات اپنی ماؤں کا دل دُکھا کر کسی غیر کے ساتھ گئی ہیں۔ ان ماؤں پر غم و الم کے پہاڑ ٹوٹے۔ لیکن ان میں سے کسی ماں نے آج تک پولیس اور عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ ان ماؤں نے اپنی بیٹیوں کی خوشی کی خاطر اپنا وقار اور اپنی ہر خوشی قربان کر دی مگر بیٹی کی عزت

پر حرف نہیں آنے دیا۔ اِن کا ردِ عمل وہی رہا ہے جو آپ کا تھا۔ لیکن انہوں نے کبھی وہ نہیں کیا۔ جو ذات برادری کے ٹھیکیداروں نے آپ سے کرایا۔

جہاں تک میرے ہندو یا مسلمان ہونے کا سوال ہے میں آپ کی بیٹی ہونے کے ناطے آپ سے ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ جب سے میں نے محبت کا مذہب اختیار کیا ہے۔ میرے لئے اسلام، ہندو دھرم یا کسی اور دھرم کی کوئی تحقیق باقی نہیں رہی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کرنے والا دھرم سے بہت اونچا اُٹھ جاتا ہے۔ اس لئے میں ہندو بھائیوں سے گذارش کروں گی کہ وہ دھرم کے نام پر میرے لئے چنتا کرنا چھوڑیں اور مسلمان بھائیوں سے التماس کروں گی کہ وہ مجھے اسلام کی عظمت کا نشان سمجھ کر میرے لئے مرنے مارنے پر تیار نہ ہو جائیں۔ ہاں میں ملک کے قانون سے درخواست کرتی ہوں کہ اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو مجھے اس کی سزا دی جائے اور اگر میں نے صرف اپنے بنیادی حقوق کا استعمال کیا ہے تو میری حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ آپ سب سے پہلے میری ماں ہیں اور اس کے بعد نیتا، زندہ باد کے نعروں کی گونج میں یہ نہیں بھولئے کہ پرمو آپ کی بیٹی ہے

بھگوان آپ کو ہر حال میں سکھی رکھے۔ آپ کے خط کا انتظار رہیگا۔

فقط

آپ کی نافرمان بیٹی

آئینہ ۲۷ ستمبر ۱۹۶۷ء

چائے کی پیالی میں طوفان

وطنِ عزیز سے دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد ۱۶/ اکتوبر کو جب میں سرینگر پہنچا، تو مجھے معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی میں میرے کچھ رقیبوں اور شہر کے کچھ رذیلوں نے میرے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ لندن میں میرے ایک مبینہ بیان کو بہانہ بنا کر ''یارانِ نکتہ دان'' نے بیان بازی، دُشنام طرازی اور الزام تراشی کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ اور اس رقصِ بے ہنگام میں میرزا محمد افضل بیگ جیسے قابل قانون دانوں اور عبدالرشید کابلی جیسے ناقابلِ سراغ رسانوں کے علاوہ بہت سے پیشہ ور بیان بازوں اور زبان درازوں نے بھی شرکت کی، حسد اور رقابت کی آگ میں جلنے والے میرے کچھ ہم پیشہ صحافیوں نے موقع غنیمت جان کر، میرے خلاف بدظنی اور بدگمانی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور عین اُس وقت جبکہ میں ہندوستان سے ہزاروں میل دور، یہاں کی سیاست کو بھول کر امریکہ کی سیاحت میں مصروف تھا، سرینگر کے اخبارات میرے ذکر سے بھرے پڑے

تھے، میں اپنے ان کرم فرماؤں، کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ کہ جنہوں نے میری عدم موجودگی میں بھی مجھے یاد کیا۔ اُن کی نیت کچھ بھی رہی ہو، لیکن میرے لئے یہ بات باعثِ اطمینان ہے، کہ میں دور جا کر بھی بہت سے دوستوں اور دشمنوں کے اعصاب پر سوار رہتا ہوں۔ سیاست میں ترقی کا یہ سب سے پہلا زینہ ہے!

مجھے ذاتی طور پر ان لوگوں سے کوئی شکایت نہیں کہ جو مجھ سے صرف اس لئے خار کھاتے ہیں، کہ میں سیاست اور صحافت، دونوں میدانوں میں انہیں بہت پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا ہوں۔ یہ لوگ دشمنی کی بجائے ہمدردی اور رحم کے مستحق ہیں۔ اور میں ان کی حالت زار دیکھ کر بارگاہِ رب العزت میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں۔ کہ اس نے مجھے حاسد نہیں محسود بنایا ہے۔ حسد اور رقابت کا جذبہ کتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ ان ...... صحافیوں سے پوچھئے کہ جو کارٹون بنا بنا کر اپنے احساس کمتری کو چھپانے اور رقابت کی آگ بجھانے میں مصروف ہیں۔ میں اُن لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ نہیں سمجھتا، کہ جن کی سیاست، قیادت اور امامت سے مجھے بنیادی اختلاف ہے۔ یہ لوگ جب میرے خلاف بات کرتے ہیں تو میرا ایمان تازہ ہوتا ہے، اور مجھے اپنے اعتقادات کی صحت اور سلامتی کا یقین ہو جاتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ غلط قسم کے لوگ میری تعریف کریں یا مجھ سے اتفاق رائے کا اظہار کریں۔ میں اسے اپنی بہت بڑی بدبختی تصور کروں گا! لیکن میں اپنے آپ کو ان ہزاروں، لاکھوں بھولے بھالے، معصوم اور بے زبان لوگوں

کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہوں، کہ جنہیں سب سے پہلے صحافیوں اور اس کے بعد سیاستدانوں نے، میرے بارے میں گمراہ کر دیا ہو۔ اور جو دیانتداری اور...... ایمانداری سے میرے مبینہ بیان سے، غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہوں، میرا روئے سخن محاذ رائے شماری کے ان لاکھوں بے لوث اور مخلص کارکنوں سے ہے کہ جنہوں نے فروری ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی انتخابات میں رات دن ایک کر کے، اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر، بخشی غلام محمد کے خلاف میری کامیابی کو ممکن بنا دیا۔ جو ابھی دو ماہ قبل مجھے اپنے ہمدرد اور اپنے رہنما شیخ محمد عبداللہ کا ایک قریب ترین ساتھی سمجھتے تھے، ان لوگوں کو بجا طور پر اس بات سے دُکھ ہوا ہو گا کہ میں نے ہزاروں میل دور جا کر لندن میں ان کی محبوب تنظیم کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں انہیں صحیح صورت حال سے واقف کر دوں۔

قبل اس کے کہ میں لندن میں اخباری نمائندوں سے اپنی بات چیت کا پس منظر بیان کروں، میں ایکبار پھر محاذ رائے شماری کے متعلق اپنی یہ نظریاتی پوزیشن واضح کر دینا چاہتا ہوں، کہ مجھے محاذ کی سیاست سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ میں نے محاذ کی قیادت اور سیاست سے اپنے اختلاف کا کئی بار اظہار کیا ہے۔ اور میں دیانتداری سے محسوس کرتا ہوں کہ گذشتہ بیس برسوں سے محاذ کا سیاسی رویہ بہت حد تک منفی اور اس کا رول غیر حقیقت پسندانہ رہا ہے۔ پچھلے دس سال کے دوران، میں نے اس اخبار میں متعدد بار محاذ رائے شماری کے سیاسی رویے اور محاذی لیڈروں کے سیاسی نظریات

پر سخت تنقید کی ہے۔ لیکن سیاسی اختلافات کے باوجود مجھے ہمیشہ اس حقیقت کا اعتراف رہا ہے کہ محاذ رائے شماری ریاست کی سب سے منظم مستحکم اور مقبول سیاسی جماعت ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی سرپرستی نے اس جماعت کو ایک ایسی مضبوط عوامی اساس عطا کی ہے، کہ جو ریاست کی کسی دوسری جماعت کو حاصل نہیں ہے اور اس حقیقت کا اعتراف محاذ کے دشمنوں کو بھی ہے کہ اس جماعت کے ساتھ بے لوث مخلص اور انتھک کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد وابستہ ہے۔ خود مجھے اس کا اندازہ ۱۹۷۱ء میں اپنی پارلیمانی انتخاب کی مہم کے دوران ہوا۔ فروری ۱۹۷۲ء میں جب سے محاذ رائے شماری نے اپنے سیاسی پروگرام اور نصب العین کو زیادہ حقیقت پسندانہ اور، میری ناچیز رائے میں، زیادہ معقول اور قابل عمل بنانے کی سعی کی ہے۔ محاذ کے ساتھ میرے سیاسی اختلافات تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ اور اگرچہ میں محاذ کا اب بھی رکن نہیں ہوں۔ لیکن میں نے اور میری جماعت پیپلز پارٹی نے محاذ کے لیڈروں کو ہر ممکن تعاون کی پیشکش کی ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد آیئے اب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ لندن میں، میں نے کیا کچھ کہا۔ اور اُسے کس طرح پیش کیا گیا!

امریکہ روانہ ہونے سے ایک دن قبل ہندوستانی ہائی کمیشن کی طرف سے لندن میں مقیم ہندوستانی اخبارات کے نمائندگان سے میری ملاقات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اور اس کا مقصد اخباری نمائندوں کو مرکزی حکومت اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان ہونے والے مذاکرات کی تفصیلات اور پس منظر سے

روشناس کرنا تھا۔ ایک گھنٹے کی اس غیر رسمی بات چیت میں نامہ نگاروں نے کشمیر کی سیاسی صورت حال، مرکز اور شیخ صاحب کے درمیان مذاکرات کی کامیابی کے امکانات، شیخ صاحب کے موقف، مرکزی حکومت کے رویے، پاکستان کے ردِ عمل، موجودہ ریاستی حکومت کے مستقبل اور متوقع سیاسی تبدیلیوں کے بارے میں کئی سوالات پوچھے، اور میں نے اپنی بصیرت اور واقفیت کی روشنی میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ محاذ رائے شماری کے متعلق بار بار یہ سوال پوچھا گیا کہ اُس نام کی جماعت کا موجودہ سیاسی ماحول میں، کیا جواز ہے، اور اب جبکہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب دونوں ہی ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کو تسلیم کرتے ہیں۔ محاذ رائے شماری کا وجود کیا معنی رکھتا ہے؟'' ظاہر ہے کہ یہ ایک اہم سوال ہے اور لندن ہی میں نہیں، امریکہ میں بھی بار بار مجھ سے یہ سوال پوچھا گیا۔ میں نہیں جانتا، کہ میرزا محمد افضل بیگ یا صوفی محمد اکبر اس سوال کا کیا جواب دیتے۔ لیکن میں نے اپنے سیاسی شعور اور اپنی بصیرت کے مطابق اس کا یہ جواب دیا، کہ محاذ رائے شماری کے اصل خالق پنڈت جواہر لال نہرو ہیں، جنہوں نے ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۵۴ء تک ایک بار نہیں، کئی بار ریاست جموں و کشمیر میں رائے شماری کرانے کا وعدہ کیا، اور یہ وعدہ انہوں نے صرف کشمیری عوام سے نہیں، ساری دُنیا سے کیا تھا۔ لیکن ۱۹۵۳ء کے بعد جب جواہر لال اور ہندوستان کی حکومت نے اس وعدے سے مکرنا شروع کر دیا، تو محاذ رائے شماری، اِس مقصد کے لئے قائم کیا گیا، کہ ہندوستان کو اپنا وعدہ یاد دلایا جائے۔ جب

تک ہندوستان کشمیری عوام کا اعتماد اور ان کی رضامندی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے محاذ رائے شماری کا سیاسی اور اخلاقی جواز باقی رہے گا۔"

"لیکن مرکزی حکومت سے شیخ صاحب اور میرزا بیگ کے حالیہ مذاکرات سے صاف ظاہر ہے۔ کہ باہمی سمجھوتے کی فضا ہموار ہو چکی ہے۔ اور محاذ رائے شماری کے صدر نے کئی بار یہ بات کہی ہے کہ وہ الحاق کی حقیقت کے بارے میں نہیں، بلکہ اندرونی خودمختاری کے سلسلے میں مرکزی حکومت سے بات چیت کر رہے ہیں؟ پھر اس کے بعد رائے شماری کا نام برقرار رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" ایک اخباری نمائندے نے سوال کیا۔

"ابھی تک چونکہ بات چیت جاری ہے، اور باہمی سمجھوتے کی کوئی آخری شکل سامنے نہیں آئی ہے، اس لئے رائے شماری محاذ کے ختم ہونے یا اس کے نام میں تبدیلی کا امکان نہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس مرحلے پر اس کا مطالبہ کرنا بھی مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ موجودہ بات چیت کی کامیابی کے بعد محاذ کے نام اور سیاسی پروگرام دونوں میں تبدیلی ناگزیر ہو جائیگی"۔ میں نے جواب دیا۔ اس مرحلے پر ایک اخباری نمائندے نے جو غالباً پی ٹی آئی سے تعلق رکھتے ہیں غصیلے انداز میں کہا کہ "اس کے معنی یہ ہیں کہ محاذ کی موجودہ حیثیت صرف ایک Bargaining Counter کی ہے؟

"جی ہاں، بالکل اِس طرح جس طرح جنگ آزادی کے دوران

کانگریس کی حیثیت ایک Bargaining Counter کی سی تھی'' میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور محاذ رائے شماری لندن کے نمائندوں کے اس بیان کے بارے میں سوالات پوچھے گئے کہ جوانہوں نے ایک ہفتہ قبل ایک اخباری کانفرنس میں دیا تھا۔ اور جس میں انہوں نے مبینہ طور پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ کشمیر کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست بنانے کے سلسلے میں اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اور اس سلسلے میں چین اور دوسرے ملک کی مدد حاصل کرنے کی بھی کوشش کرینگے۔ ایک اخباری نمائندے نے اس بیان کی طرف میری توجہ مبذول کراتے ہوئے دریافت کیا۔ کہ محاذ رائے شماری میں اس قسم کے تضاد کا کیا پسِ منظر ہے اور اس بارے میں میری کیا رائے ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ''میں نہیں جانتا۔ کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ یا ان کے دوسرے ساتھیوں نے کیا کچھ کہا ہے۔ لیکن انگلستان کی محاذ رائے شماری کے لیڈر جو بھی کہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ محاذ رائے شماری کے صدر میرزا افضل بیگ مرکزی حکومت کیساتھ اندرونی خود مختاری کے سوال پر بات چیت کرر ہے ہیں جہاں تک ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا سوال ہے۔ ہر مسئلے پر ان کی اپنی رائے ہے اور یہ بات میں پورے وثوق کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے، اپنی ذاتی حیثیت میں کہا ہے، شیخ صاحب کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں کہا ہے''۔

میں نے قدرے تفصیل کیساتھ اخباری نمائندوں سے اپنی گفتگو کے

وہ اقتباسات پیش کیے ہیں ، کہ جنہیں سیاق وسباق سے الگ کر کے اخباروں میں شائع کیا گیا تھا۔ اور جن کی بنیاد پر محاذ کے لیڈروں ، کارکنوں اور ہمدردوں نے ہی نہیں، محاذ کے ازلی دشمنوں نے بھی میرے خلاف ایک طوفان بپا کر دیا تھا۔ محاذ کے ان مخلص اور بے غرض کارکنوں اور ہمدردوں سے مجھے کوئی شکایت نہیں کہ جنہوں نے میرے مبینہ بیان پر اپنی ناراضگی اور برہمی کا اظہار کیا۔ محاذ کے اُن دشمنوں سے بھی کوئی گلہ نہیں کہ جنہوں نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کرنا چاہی لیکن محاذ کے صدر میرزا محمد افضل بیگ سے مجھے سخت شکایت ہے کہ وہ اس بات کی تصدیق کئے بغیر کہ میں نے کیا کہا ہے، میرے خلاف بیان بازی کی مہم میں شریک ہو گئے۔ انہیں اس بات کا ذاتی طور تجربہ ہے کہ اخبار والے کس طرح بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ خود سرینگر سے شائع ہونے والے اخبارات نے کئی باران کے بیانات کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا کہ انہیں دوسرے دن اپنے ان بیانات کی وضاحت میں دوسرا بیان جاری کرنا پڑا۔ یہ حادثہ اگر ان کے ساتھ پیش آیا ہے تو میرے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ وہ میرے بیان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے تھے۔ کہ میں نہیں جانتا، کہ شمیم صاحب نے درحقیقت کیا کہا ہے لیکن جو کچھ ان سے منسوب ہوا ہے۔ وہ اگر صحیح ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے محاذ کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے، بہر حال، میں ان کی واپسی تک اپنے تاثرات محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔...... لیکن انہوں نے اخبارات میں شائع شدہ بیان کو حرف آخر سمجھ کر جب اپنے غیض وغضب کا

اظہار کیا، تو صوفیوں، گلکاروں اور تبرداروں نے مغلظات بکنے میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کی۔ بیگ صاحب کے اور محاذ کے دوسرے سرکردہ رہنماؤں کے اس ردِ عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک ہماری سیاسی قیادت میں تدبر، ضبط، تحمل اور توازن پیدا نہیں ہوا ہے۔ مان لیجئے کہ اخبارات میں مجھ سے جو الفاظ منسوب ہوئے ہیں۔ وہ حرف بحرف صحیح تھے۔ جب بھی اس ہنگامہ آرائی کی کیا ضرورت تھی کہ شہر کا چھوٹا اور بڑا، اصلی اور نقلی لیڈر بیان پر بیان دے رہا ہے۔ اسے ایک فردِ واحد کی ذاتی رائے سمجھ کر نظر انداز کیوں نہیں کیا گیا۔ کیا خدانخواستہ محاذ کی سیاست اور قیادت کا آبگینہ اتنا نازک ہے کہ ایک غیر محاذی کے لندن میں ایک بیان سے اس کے چور چور ہو جانے کا امکان تھا؟ اس قسم کا ردِ عمل یقیناً سیاسی پختگی اور ذہنی بلوغت کی علامت نہیں۔ اور اس بار بھی شیخ محمد عبداللہ نے اپنی بلند نظری دور اندیشی اور عالی ظرفی کا ثبوت دے کر یہ ثابت کر دیا، کہ اصلی لیڈر کی آن اور شان ہی مختلف ہوتی ہے۔ شیخ صاحب نے نہ صرف یہ کہ میرے بیان پر کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ بلکہ میرے خلاف بازاری زبان میں شرانگیز پرپگنڈا کرنے پر سخت ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کیا۔

بیگ صاحب مسلمہ قانون دان ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ قانون کی نگاہوں میں بھرے بازار میں قتل کرنے والے ملزم کو بھی اپنی صفائی کا موقع دینے کے بعد ہی سزا دی جا سکتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ میرے بارے میں انہوں نے فردِ جرم کے ساتھ ہی اپنا فیصلہ بھی کیوں صادر فرمایا؟ میں یہ ماننے

کیلئے ہرگز تیار نہیں کہ وہ بھی کا بلیوں اور گلکاروں کی طرح میرے خلاف کوئی نہ کوئی بہتان تراشنے کی تاک میں تھے۔ انہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے اور انہوں نے بے جا طور پر Over React کیا ہے میری واپسی سے پہلے ہی چائے کی پیالی میں یہ طوفان ختم ہو گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے۔ کہ پختہ کار اور تجربہ کار سیاسی رہنماؤں کو اخباری بیانات کی بنیاد پر اپنا فوری ردِ عمل ظاہر کرنے سے گریز کرنا چاہیے...... مجھے اُمید ہے کہ میری اس وضاحت اور صراحت کے بعد ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی!

۲۳/اکتوبر سرینگر
شمیم احمد شمیم

اکتوبر ۱۹۶۶ء

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

جموں کے طلباء پر پولیس کی وحشیانہ فائرنگ پر پچھلے بارہ دنوں میں اتنے آنسو بہائے جا چکے ہیں کہ مزید آنسو بہانے کی ضرورت نہیں۔ تحقیقاتی کمیشن کا فیصلہ کچھ بھی ہو۔ عوامی عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ ۱۷ اکتوبر کو پولیس نے انتہائی بہیمت اور بربریت کا ثبوت دیا۔ اور ایک ایسی افسوسناک صورت حال پیدا کردی جسے بڑی آسانی کے ساتھ ٹالا جا سکتا تھا خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ حکومت نے فائرنگ اور تشدد کا جواز تلاش کرنے کی بجائے فوری طور عدالتی تحقیقات کا حکم دیا۔ اور کمیشن نے بغیر کسی تاخیر کے اپنا کام شروع کردیا ہے۔ عدالتی تحقیقات کا دائرہ کار صرف ۱۷ اکتوبر کے افسوسناک واقعات تک ہی محدود رہے گا۔ لیکن میرے نزدیک ان واقعات کا تعلق ریاست کے پورے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے سے ہے اور اب اگرچہ جموں میں اضطرار اور ہیجان کی کیفیت رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم عدالتی تحقیقات کی محدود دنیا سے باہر آکر ان اسباب و علل کی کھوج لگائیں، جو اس قسم کے واقعات کو جنم دیتے ہیں۔

عام گفتگو اور سیاسی تذکروں میں جموں وکشمیر کا نام اس طرح لیا جاتا ہے کہ جیسے جموں اور کشمیر نہ صرف ایک سیاسی وحدت ہو، بلکہ ایک جغرافیائی، تہذیبی اور لسانی اکائی بھی۔ اس طرح جموں وکشمیر کے سیاسی مسائل کے متعلق سوچتے ہوئے ملک کا ہر دانشور یا سیاسی لیڈر یہ سمجھتا ہے کہ ان دونوں حصوں کے مسائل ان میں بسنے والے لوگوں کی نفسیات اور ان کا ذہنی رویہ ایک سا ہے۔ اس غلط اور گمراہ کن مفروضے کو سامنے رکھ کر صورت حال کو بہتر بنانے کے جتنے حل پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جموں کو خوش کرنے کی کوشش میں کشمیر ناراض ہو جاتا ہے اور کشمیر کو مطمئن کرنے کی ہر کوشش کا انجام جموں کی برہمی ہوتا ہے اسی تلخ اور ناگوار حقیقت کے پس منظر میں ڈاکٹر کرن سنگھ نے وہ نزاعی تجویز پیش کی تھی۔ جس کی رُو سے لسانی بنیادوں پر ریاست کی از سر نو تشکیل کا حل پیش کیا گیا تھا۔ جموں اور کشمیر کی فرضی وحدت کا راگ الاپنے دلالوں نے اس وقت اس تجویز کو شر انگیز قرار دیا تھا اور ملک میں بھی کچھ ناعاقبت اندیش بزرگ اسے غیر ملکیوں کی تفرقہ پردازی سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن جموں کے حالیہ واقعات نے ایک بار پھر اس نفسیاتی خلیج کو گہرا کر دیا ہے۔ جو دو لسانی صوبوں کے درمیان بعض تاریخی وجوہات کی بناء پر موجود ہے اور جس نے ایک نہایت ہی ناپسندیدہ اور مریضانہ ذہنی عصبیت کو جنم دیا ہے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ جموں میں طلباء پر پولیس فائرنگ کا اس تاریخی، تہذیبی اور لسانی تضاد سے کیا تعلق ہے؟ میں کہتا ہوں کہ تعلق ہے اور گہرا

تعلق ہے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ اس کشمکش اور تضاد نے
جموں کو سیاسی لیڈر شپ سے محروم کردیا ہے، اور پچھلے اٹھارہ برسوں
میں یہاں کوئی مثبت سیاسی تحریک نہیں اُبھر سکی ہے۔ جموں کے عوام کی
بیزاری، بے چینی، ان کی اُمیدوں اور آرزوں کے اظہار کا کوئی فطری وسیلہ
باقی نہیں رہا ہے۔ اسی لئے وہ بات نہیں کرتے ہیں۔ چلاتے ہیں، وہ آنسو
نہیں بہاتے، چیختے ہیں، وہ احتجاج نہیں کرتے۔ دھمکی دیتے ہیں
اور ہمارے پاس ان سے بات کرنے، ان کی بات سننے کا کوئی ذریعہ ہی
نہیں۔ ہم گردھاری لال ڈوگرہ، پنڈت ترلوچن دت اور سردار کلبیر سنگھ کو
جموں سمجھ کر ان کی نفسیات اور اس کے مسائل سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور
جن لوگوں کو جموں میں صرف چند گھنٹے گذارنے کا بھی موقع ملے۔ ان کو فوراً
یہ احساس ہوگا کہ ان لوگوں کی جموں میں نہ کوئی عزت ہے اور نہ ساکھ۔ ابھی
پچھلے دنوں جب وہاں صورت حال خراب تھی، تو صورت حال کو بہتر بنانے
کیلئے ہم نے شری گردھاری لال ڈوگرہ اور میجر پیارا سنگھ کو وہاں روانہ کیا۔
اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جموں سے بات کرنے کے لئے ہمارا
Channal کیا ہے۔ جموں کی بڑھتی ہوئی بے چینی، بے اطمینانی اور
ناآسودگی کا مطالعہ کرنے کیلئے اولاً ہم نے کبھی کوشش نہیں کی۔ اور اگر کی بھی
تو یہ کام ہم نے جموں کے ان لیڈروں کے سپرد کیا۔ جن کو ان کے خاندان
کے افراد بھی عزت واحترام کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ان لیڈران کرام کا ذہنی
اور سماجی رابطہ چونکہ عوام سے کٹ چکا ہے، اس لئے انہوں نے اپنی سجی سجائی

خواب گاہوں میں بیٹھ کر صورت حال کا مطالعہ کیا۔ اور ''سب ٹھیک ہے'' کہہ کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے۔ میرے نزدیک ۱۷؍اور ۱۸؍اکتوبر کا سانحہ انتظامی مشینری کی بے راہ روی سے زیادہ سیاسی قیادت کی مجرمانہ غفلت شعاری کا نتیجہ ہے۔ شری ترلوچن دت اور ان کے صاحبزادوں کی خرمستیوں کے خلاف جب آج سے صرف ایک ماہ پہلے جموں کے طالب علموں نے اپنی بڑھتی ہوئی بے چینی اور برہمی کا ایک ہلکا سا اظہار کیا تھا۔ تو جموں کانگریس نے اس مرحلے پر مسٹر دت اور ان کے صاحبزادوں کو کانگریس اور سوشلزم کی علامت سمجھ کر ان کی مدافعت کیوں ضروری سمجھی؟ خواجہ غلام محمد صادق نے وزیر صحت سے فوری طور استعفیٰ کیوں طلب نہیں کیا۔ اور اس طرح جموں کی زخمی غیرت پر مرہم رکھنے کی کیوں کوشش نہیں کی گئی؟ یہ ایسے سوالات ہیں، جن کا جواب دیئے بغیر جموں کے حالیہ سانحہ کو اپنے اصلی پس منظر میں نہیں دیکھا جاسکتا۔

اگریکلچر کالج کے طلباء کے مطالبات صحیح تھے یا غلط؟ ان کی بھوک ہڑتال جائز تھی یا ناجائز؟ طلباء میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی کا کوئی علاج ہے یا نہیں؟ اس وقت ان پر تفصیل سے بات کرنا مقصود نہیں۔ لیکن ایک بات جاننے کی خواہش شدید سے شدید تر ہو جاتی جارہی ہے اور وہ یہ کہ کیا ذرا سے تدبر اور تحمل سے اس افسوسناک صورت حال کو نہیں ٹالا جاسکتا تھا؟ میں ان لوگوں سے نہیں ہوں، جو یہ کہتے ہیں کہ طلباء ہمارے مستقبل کے معمار ہیں اور ان پر ہرگز ہرگز گولی نہیں چلانا چاہیے۔ اگر مستقبل کے معمار اپنے مستقبل

کے ساتھ ساتھ قوم کے مستقبل کو بھی تباہ کرنے پر آمادہ ہوں۔ تو ان کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیجیئے۔ لیکن کیا ۱۷ اکتوبر کو قوم کا مستقبل اور ملک کی سلامتی واقعی خطرے میں پڑ گئی تھی؟ کیا تین یا چار سو طلباء کے ایک احتجاجی جلوس سے واقعی اقتدار کے ایوانوں میں زلزلہ آنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا؟ جموں کے وہ ''محبوب'' لیڈر کہاں تھے۔ جو جموں کے نام پر وزارت اور تنظیم کے مسندوں پر جلوہ گر ہیں؟ ان میں سے کسی نے جا کر طالب علموں سے بات کیوں نہیں کی اور اگر طالب علم ان کی بات سننے پر آمادہ نہ تھے۔ تو کیا مسلح پولیس بھی ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی؟ انہوں نے پولیس کو ضبط وتحمل اور تدبر کا درس کیوں نہیں دیا۔ جموں سے آمدہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۷ اکتوبر کو پولیس نے ایک مہذب حکومت کی مشینری کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ڈاکوؤں کے ایک وحشی گروہ کی طرح اپنی ''بے عزتی'' کا انتقام لیا۔ میں بڑی دیانتداری سے محسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کی صورت حال کا پیدا ہونا ریاست کی سیاسی قیادت کی ناکامی کا کھلا ہوا اشتہار ہے۔
اس سانحے کی جوڈیشل تحقیقات سے طالب علموں کی فوری تسکین تو ہو جائے گی۔ لیکن اصل مسئلے کی طرف سے توجہ ہٹ جانے کا زبردست امکان ہے۔
اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس صورت حال کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات ہو، جس نے موجودہ صورت حال کو جنم دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر صادق صاحب اور ان کی تنظیم نے اس نازک مرحلے پر بھی جموں کے سیاسی مسئلے کو سمجھنے کی کوشش نہ کی، تو مستقبل قریب میں جموں اور کشمیر کو ایک ساتھ رکھنا تقریباً ناممکن

ہوجائیگا۔ کیونکہ جموں کے بگڑ ے ہوئے لوگوں کوشانت کرنے کے لئے صادق صاحب اوران کی حکومت نے جتنے بھی اقدامات کئے۔ ان کا اثر زیادہ دیر پانہیں ہوسکتا۔ سیاسی سطح پرایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیاجاناچاہیے۔ جوجموں کی سیاسی ...... ناآسودگی، ذہنی بے اطمینانی اورنفسیاتی کشمکش کے بنیادی محرکات کا جائزہ لے۔اور سیاسی قیادت کی عدم موجودگی میں براہ راست عوامی مسائل کوسمجھنے کے لئے کوئی موثر مشینری قائم کرنے کی طرف توجہ دے۔ میں سمجھتاہوں کہ عام انتخابات کے فوراً بعد ڈاکٹرکرن سنگھ کے لسانی فارموں پرازسرنوغورکرنے کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے۔ کیونکہ جموں کا حالیہ سانحہ براہ راست جموں کی اس مجروح انانیت کی علامت ہے جواپنے اظہارکاوسیلہ چاہتی ہے۔

اگست ۱۹۷۶

حقیقت خرافات میں کھوگئی (۱)

۹ر اگست کی تاریخ پر تواریخ کا عجیب سایہ پڑا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے بعد یہ ہندوستان میں ایک نہایت اہم تاریخی اہمیت کا حامل بن گیا۔ کیونکہ اسی دن مہاتما گاندھی نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی وہ تحریک شروع کردی جو کافی خون خرابے کا باعث بنی اور جسے آخر کار انگریزوں نے کچل دیا۔ اس سال بھی اس دن کو قومی پیمانے پر منایا گیا۔ لیکن جموں و کشمیر میں اس دن کی اہمیت ۱۹۵۳ء کے بعد دوچند ہوگئی ہے۔ اس دن جو کچھ ہوا۔ وہ آج ہی کیا، ہماری تاریخ کے ہر دور میں قیاس آرائی، کشمکش اور تضاد خیالی کا باعث بنتا رہے گا۔ عوامی نقطہ نظر سے یہ کشمیر کی تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا کہ اس دن کے بعد تقریباً ایک مہینے تک ساری وادی میں قتل و غارت اور خون ریزی کا سفاکانہ مظاہرہ ہوا۔ جس میں اگر ہزاروں نہیں تو بہر حال سینکڑوں کشمیری کٹ کٹ کر گرے، اور ایک ایسے مقصد کی خاطر قربان ہوگئے، جس کی ماہیت ان رہنماؤں کے نزدیک اب بھی مبہم اور مدہوم ہے۔ جن کی گرفتاری نے اس آتش فشاں کو لاوا اُگلنے کی تحریک دی تھی، یہ گمنام شہید آج اپنی وطن کی مٹی کا

حصہ بن چکے ہیں، لیکن اُس پرآشوب اور پُر اسرار دن کے احکامات، اقدامات اور امکانات پر ہونے والی بحث روز بروز اُلجھتی جارہی ہے۔ جب ۹راگست ۱۹۵۳ء کو شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کو اپنے عہدوں سے برطرف کر کے گرفتار کیا گیا تو اسی روز شام کو نئے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے ریڈیو کشمیر سرینگر سے اپنے نشری پیغام میں کہا تھا کہ ''قومی مقاصد کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کچھ منزلیں ایسی آتی ہیں۔ جب قومی مقاصد کو ذاتی وفاداریوں اور دوستی پر ترجیح دینا پڑتی ہے اور آج کے دن اُن رفیقوں کے اور ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے ہیں جن کے کاندھے سے کاندھا ملا کر ہم نے آزادی کی جنگ لڑی تھی۔'' بخشی صاحب کے بعد اُس نظام کے نظریہ ساز خواجہ غلام محمد صادق نے ایک طویل بیان میں اس اقدام کو برمحل اور بروقت قرار دیا۔ اور کہا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا۔ تو ریاست کی تحریک آزادی کے اُن مقاصد پر زک پڑنے کا اندیشہ تھا۔ جن کا مقصد یہاں ایک سیکولر، سوشلسٹ اور جمہوری نظام قائم کرنا ہے، انہوں نے دبے الفاظ میں یہ الزام بھی لگایا کہ ریاست کی سالمیت اور ہند کے ساتھ ریاست کے رشتے کے خلاف سازشیں ہورہی تھیں اور جدا ہونے والے رہنما اپنے سیاسی ماضی اور اس کے منطقی ارتقاء سے برگشتہ اور منحرف ہو گئے تھے، الزامات اور جوابی الزامات کا یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا لیکن ۱۹۶۴ء میں موئے پاک کے سانحے کے بعد ہونے والے واقعات نے فریقین کو اپنے اپنے نظریات پر نظر ثانی کے لئے مجبور کر دیا۔ اور بخشی صاحب اور صادق صاحب دونوں

نے اپنی سیاسی لائن کی صحت پر اصرار کرنے کے باوجود یہ اعتراف کیا کہ ۱۹۵۳ء کے واقعات کے ساتھ زیادہ دور اندیشی اور تدبر کے ساتھ نپٹا جاسکتا تھا اور خون خرابے کو بڑی حد تک روکا جاسکتا تھا۔ یہی مرحلہ سیاسی سوچ کے اُس موڑ کا مظہر تھا جب دہلی کے حکمرانوں کو اندازہ ہوگیا کہ کشمیر میں صرف جبر وتشدد کی پالیسی کامیاب نہیں ہوسکتی اور ۹/اگست کے شکار لیڈروں کے ساتھ مکالمے اور مفاہمت سے بہر حال ملک کے مفاد کو تقویت حاصل ہوگی۔ صادق صاحب اس نئی سوچ کے ترجمان تھے اور ان کی لبرلائیزیشن کی پالیسی تاریخ کی اس نئی منطق کی پیداوار تھی۔ اس کے بعد محاذ کے لیڈر ۹/اگست کو یوم سیاہ کے طور پر مناتے رہے۔ لیکن ان کے جواب میں بخشی دور کے برعکس ان کے سیاسی حریفوں نے یوم نجات نہیں منایا۔ خود محاذ کے لیڈروں کی شعلہ بیانی آہستہ آہستہ نرم پڑتی گئی، اور اُن کے بیانات کی نہج میں صاف طور یہ بات جھلکنے لگی کہ وہ صرف ماضی کی تلخ یادوں کو ہی فراموش کرنے پر تیار نہیں ہیں بلکہ وہ بڑے بڑے سیاسی مسائل کو ملتوی کر کے اقتدار کے انتقال پر مفاہمت کی ابتداء کرنے کو تیار ہیں۔

اگست ۱۹۷۶

(۲)

۱۹۷۱ء کے واقعات اور بنگلہ دیش کی آزادی نے کشمیر کے سارے سیاسی تناظر کو بدل کے رکھ دیا اور فروری ۱۹۷۳ء کو محاذ رائے شماری کے صدر اور جنرل سیکریٹری نے دہلی سے ایک بیان جاری کر کے حقِ خودارادیت کو رائے شماری کی سطح سے تبدیل کر کے ''الحاق کی حدود اور حقدار'' تک پہنچایا اور یہی مرکزی حکومت کے ساتھ اُن کی معنی خیز گفت وشنید کا نقطہ آغاز تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرکزی حکومت بڑے طویل عرصے تک اس بات چیت کو تقریباً غیر سرکاری سطح تک محدود کرتی رہی اور اس کو کسی قسم کی قابل گرفت پبلسٹی بھی نہیں دی گئی۔ کشمیر میں انہی دنوں صادق صاحب کی وفات کے بعد سید میر قاسم نے وزارت اعلیٰ کا قلمدان سنبھالا تھا۔ قاسم صاحب تحریک آزادی کی پہلی صف سے نہیں بلکہ دوسری صف سے تعلق رکھنے والے رہنما ہیں، اور شاید اُن کی نرم مزاجی اور خلوصِ نیت کا سیاست کار آج تک کشمیر نے پیدا نہیں، انہوں نے اپنے اقتدار کی منزل ''پرانی لیڈرشپ'' کے ساتھ مفاہمت قرار دیا اور اعلان کیا کہ میں بطور پُل کے کام کرنے کو تیار

ہوں، مگر شرط یہ ہے ۔ کہ کوئی مجھے بطور پُل استعمال تو کرے ، بعد کے واقعات نے ثابت کردکھایا کہ قاسم صاحب نے اپنے عہد کا ایفاء کیا اوراقتدار کی منتقلی میں انتہائی اہم رول ادا کیا۔ کشمیر اکارڈ کی سیاسی حیثیت پرایک بے لاگ نظرڈالنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس میں سے مرکز نے اُسی حد تک دفعہ ۳۷۰ کے تحفظ کی گارنٹی دینے کا عہد کیا ہے۔ جیسا کہ بخشی صاحب یا صادق صاحب کے وقت میں کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ۹ راگست ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال ہونے کا کہیں اکارڈ میں بالواسطہ یا بلا واسطہ کوئی ذکر نہیں ہے اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جس قیادت کے ساتھ اکارڈ ہوا ہے، اُس نے ۲۲ سال کے سیاسی حقائق کو بڑی حد تک اگر نظریاتی طور نہیں تو واقعاتی طور ضرور تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اکارڈ کے بعد حکومت اور نیشنل کانفرنس کا اس سلسلے میں کیا رویہ رہا، اس کے لیڈروں کی تقاریر اوراس کی حکومت کے احکامات واقدامات سے یہ بات صاف مترشح ہے کہ یہ (Statusquo) سے بڑی حد تک مطمئن ہے اوراس کی سیاسی کاوش کا بنیادی مقصد اب نیشنل کانفرنس کے جماعتی اختیار کے استحکام تک محدود ہوکر رہ گیا ہے ، سیاسی حقیقت پسندی کا یہ رویہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس کو جب تک نظریاتی تاویل اور مسلک کی جدید ترتیب میں شکل پذیر نہیں کیا جاتا یہ موجودہ حکومت کی پوزیشن کے متعلق تضاد آرائی کا باعث بنا رہے گا۔ بیگ صاحب کا یہ کہنا کہ ۹ راگست ۱۹۵۳ء کو بخشی، صادق، یا قاسم صاحب نے تحریکِ آزادی کشمیر کے دشمنوں سے گٹھ

جوڑ کیا تھا، نیشنل کانفرنس کے موجودہ سیاسی (Posture) کی روشنی میں کسی طرح بھی قابل فہم نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیگ صاحب ۹/اگست ۱۹۵۳ء کے بعد ہونے والی بدعنوانیوں کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں اور اُس کا علاج ''محاسبے'' کا وہی تصور ہے، جسے ہماری حکومت ضرورت پڑنے پر ایک لفظی گرز کے طور پر کانگریسیوں کو سہما دینے کے لئے استعمال کرتی ہے لیکن جس کے عمل آمد ہونے یا حقیقت بننے کا امکان ہر گذرنے والے دن کے ساتھ تاریک ہوتا جا رہا ہے۔

اگست ۱۹۶۸

چیکوسیلوا کیہ کی عصمت دری!

۲۰/اپریل ۴۵ء کو اڈولف ہٹلر نے جب برلن کی چانسلری میں خودکشی کرلی تو بہت سے اُمید پسندوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ عالمی معاملات میں زورزبردستی کا اگر خاتمہ نہیں بھی ہوا، پھر بھی اُس ننگے اور عریان جبر کا دور غروب ہوگیا۔ جس کے تحت ہٹلر بیسویں صدی میں بھی دورِ وحشت کی یاد تازہ کررہا تھا اور درندگی کے بے شرمانہ مظاہرے سے چھوٹی قوموں کی کلائیاں مروڑ دیا کرتا تھا۔ اُس وقت سودیت یونین کی فاتح فوج مشرقی یورپ کے ملکوں کو نازِ آسیب کے پنجوں سے نکال کر وہاں آزادی کے پرچم بلند کررہی تھی۔ اوران ملکوں نے سرخ فوج کے جلو میں ایک نجات دہندہ کا سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن تاریخ کا یہ بے رحمانہ مذاق ہے کہ جس چیکوسوا کیہ کی سرزمین پر ہٹلر کی شمشیرِ استبداد پہلی مرتبہ نیام سے نکل کر قہروغضب کے ایک بے مثال سیلاب کی خبر لائی تھی۔ وہیں سودیت یونین کے چہرے سے بھی حریت اور مظلوم نوازی کے خوشنما نقاب تار تار ہوگئے ہیں اور اس کا ڈراؤنا نوآبادی روپ دیکھ کر ساری دنیا کے حریت پسند ایک نئے خطرے کے سگنل سے سہم اُٹھے ہیں۔ سودیت یونین میں جوزف

اسٹالین کی موت کے بعد مرحلہ وار اعتدال پسندی کا جو تاریخ ساز عمل شروع ہوا۔ اس سے یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ اب عالمی کمیونسٹ تحریک جبر اور استبداد کا لبادہ پھینک کے معقولیت کی راہ اختیار کرے گی اور اس طرح سے دنیا کے لئے ایک نئی اُمید پیدا ہو جائے گی۔ ہنگری کے خونین واقعات نے اگرچہ ان توقعات کو شدید صدمہ پہنچا دیا لیکن بعد میں چین اور روس کی نظریاتی آویزش میں روس نے جو غیر جارحانہ رویہ اختیار کر لیا، اُس نے ایک اور بار اِس خوش فہمی کو جنم دیا کہ روس اب عالمی معاملات میں زور زبردستی کا قائل نہیں رہا۔ چیکوسلواکیہ پر روس کے بے شرمانہ حملے اور غاصبانہ قبضے نے احساسات کے ان تمام نازک آبگینوں کو ٹینکوں کے بوجھل پہیوں سے چُور چُور کر کے رکھ دیا ہے۔ چیکوسلواکیہ کے نئے لیڈر جن کی رہنمائی، الیگزنڈر وبچک کر رہے تھے، راسخ الاعتقاد کمیونسٹ تھے۔ وہ سوشلزم تعمیر کرنے کے زبردست حامی تھے اور وہ سامراج دشمنی کے سلسلے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اُن کا قصور یہ تھا کہ وہ تاریخ کے قدموں کی چاپ سن کر کمیونزم کو زیادہ معقول اور زیادہ مقبول صورت بخشنا چاہتے تھے۔ روسی لیڈروں نے اُن پر تحریف پسندی کا الزام لگایا۔ لیکن اگر روسی لیڈروں کے اس الزام کو قطعی مانا جائے تو پھر خود وہ ماوزے تنگ اور اس کے رفیقوں کے سامنے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ کیونکہ ماؤ بھی روسی لیڈروں پر تحریف پسندی اور سامراج نوازی کا الزام لگا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چیک رہنما اپنے ملک کے مخصوص مسائل اور کمیونزم کی تعمیر کے لئے اپنے سازگار طریقے

کے سلسلے میں اپنے ذہن و ضمیر کو ماسکو کے طوق و سلاسل سے آزاد کر کے
آزادی کے ساتھ سوچنا چاہتے تھے۔ سوویت یونین کے لیڈروں نے اس
مرحلے پر وہی کچھ کہا جو تاریخ کے بڑے بڑے جابروں اور ظالموں نے کہا
ہے۔ انہوں نے کسی جھجک اور شرم کے بغیر آزادی، ہم وجودیت، عدم
مداخلت وغیرہ کے اصولوں کو برف خانے میں ڈال کے آتش و آہن کے عظیم
طوفان کے سیلابی دروازے کھول دیئے اور چیکوسلواکیہ کے حُریت پسندوں کو
اپنی دانست میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ انسانی ضمیر اس صدمے کی ڈرامائی
تعجیل سے اس قدر ششدر ہو کر رہ گیا ہے کہ ایک دلگداز آہ کے سوا، پورے
طور پر اس کا ردِ عمل بھی ظاہر نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن ایک بات صاف ہے کہ
اس وحشیانہ اقدام نے سوویت یونین کو سامراجیوں کی اُسی قابلِ نفرت صف
میں لا کھڑا کر دیا ہے جو اپنی ظالمانہ خصلت اور خون آشام فطرت کے لئے
بدنام ہے۔ روس کی مذمت میں اُس کے مغربی حریف ہی نہیں بلکہ اس میں
معاہدہ وارسا کا ایک رکن ملک رومانیہ، یوگوسلاویہ اور دنیا کے بیشتر کمیونسٹ
پارٹیاں شامل ہیں۔ جہاں تک چیکوسلواکیہ کا تعلق ہے۔ شاید روس کچھ دنوں
کے لئے وہاں جابر افواج کے قیام کے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن
آزادی کی جو تڑپ دُوبچک اور اُس کے ساتھیوں نے پیدا کی ہے۔ اُس کو ختم
کر دینا ٹینکوں اور بمبار جہازوں کی قدرت سے باہر ہے۔ اگر سٹالین کے
تاریک دور کے خاتمے کے لئے خود اُسی کے سائے میں پلنے والا کروشچوف
پیدا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دُوبچک کی آواز کی اجابت میں چیکوسلواکیہ کی

زرخیز سرزمین مناسب صدائے بازگشت پیدا نہ کرے۔ یہ معاملے کا محدود پہلو ہے۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ سوویت یونین کا سُر دنیا میں ہمیشہ کیلئے نیچے ہوگیا ہے۔ ہنگری کے شرمناک واقعات کا داغ ابھی دُھلنے نہ پایا تھا، لیکن چیکوسلواکیہ میں روس گھٹنوں گھٹنوں غلاظت میں ڈوب گیا ہے۔ روس کی بے داغ امیج بحال کرنے کے لئے اب شاید دہائیوں کی نہیں بلکہ صدیوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی کمیونسٹ تحریک کو بھی ایک ایسا دھچکا اُٹھانا پڑا ہے۔ جو اس کے بدترین دشمن بھی اسے نہ پہنچا سکتے تھے۔ دورِ سٹالن کے مظالم ہنگری کے واقعات وغیرہ کی وجہ سے کمیونزم کی چڑھتی ہوئی لہر پہلے ہی زوال آمادہ تھی۔ چیکوسلواکیہ کے واقعات نے بلا مبالغہ اِسے موت کے صدمے سے آشنا کردیا ہے۔ اب ساری دنیا میں کمیونسٹ آزادی اور انصاف کے نام پر تائید وحمایت حاصل کرنے کو انتہائی صبر آزما پائیں گے۔

ہندوستان کی حکومت نے اس انقلاب آفرین موڑ پر جس کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کے ضمیروں پر فالج کا جو دورہ پڑا ہے۔ اُس کے اثرات کس قدر ہلاکت آفرین ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میں اُسی وقت تک جانبدار ہوں جہاں تک حق اور انصاف کا باطل اور بے انصافی سے مقابلہ نہیں ہوتا۔ جونہی یہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوجائیں۔ میری ہمدردیاں واضح طور پر حق اور انصاف کے ساتھ ہیں۔ لیکن ہماری حکومت تک آتے آتے نور اور بصیرت کا

یہ عرفان مصلحت پسندی، دروغ گوئی اور بے اُصولی کے ایسے اندھیارے میں تبدیل ہوگیا ہے کہ ہمارے ملک کا روشن چہرہ دنیا کی نظروں میں سیاہ ہوگیا ہے۔ چیکوسلواکیہ کے واقعات کی مذمت میں اگر رومانیہ اور یوگوسلاویہ جیسے سوشلسٹ ملک اور ڈیگال جیسا روس نواز پیش پیش ہو سکتے ہیں۔ تو ہماری حکومت کیوں پسینہ پونچھتے ہوئے صرف اپنی رائے عامہ کو خاموش کرنے کے لئے یہ گندے کھیل کھیل رہی ہے۔ سیکورٹی کونسل کے پلیٹ فارم پر ہندوستانی نمائندے نے ووٹنگ کے وقت غیر جانبدار رہ کر دراصل ہماری جمہوریت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔ ساری دنیا آزادی اور جمہوریت کے ہمارے دعویٰ پر یقین نہیں کرسکتی۔ کیونکہ ہم نے اس معاملے میں جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُس سے ایک احساس جرم کا سراغ ملتا ہے۔ شکر اس بات کا ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں اشوک مہتہ جیسے بے باک لیڈروں کی کمی نہیں ہے۔ جو چیکوسلواکیہ کے مظلوم عوام کو ساری دنیا کے مظلوم عوام کی علامت سمجھ کر اُن کی حمایت میں اقتدار کی کھوکھلی کرسی کو پائے حقارت سے ٹھکرا سکتا ہے۔ اندرا حکومت نے اس مرحلے پر جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُس سے دنیا میں ہمارے ملک کا گھٹتا ہوا قد اور گھٹ کے رہ گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی خود ہمارے ذہن و ضمیر میں خلش اور احساس جرم کے کتنے ہی نوکیلے کانٹے چبھو دیئے ہیں۔

اپریل ۱۹۷۷

کشمیر کا جے پرکاش نرائن

شری جے پرکاش نرائن اور مولانا محمد سعید مسعودی کے کردار اور موجودہ رول میں ایک گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں رہنما میدان سیاست کے بہت پُرانے شہ سوار اور آزمودہ کار کھلاڑی ہونے کے باوجود اقتدار کی کثافتوں سے پاک و صاف ہیں۔ دونوں طویل عرصے تک عملی سیاست کی ہنگامی آرائیوں سے دور تماشائے اہل کرم دیکھتے رہے ہیں اور دونوں ہی ایک ایسے وقت متحرک ہو کر بحر سیاست میں کود پڑے ہیں کہ جب عام طور پر اہل سیاست، اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے اور سفر عاقبت کیلئے زادِ راہ تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دونوں رہنماؤں کی جسمانی حالت سخت محنت تو الگ روزانہ کے معمولات پورا کرنے کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ دونوں دنیاوی آسائشوں شان و شوکت اور جاہ و حشمت کی ظاہری علامتوں سے بے نیاز ہیں اور دونوں ہوس اقتدار سے بلند، اخلاق اور روحانی اقدار کے پرستار ہیں لیکن سیاست اور اقتدار سے اس ظاہری لاتعلقی اور بے التفاقی کے باوجود دونوں رہنماؤں کے نحیف اور ناتواں کندھوں پر

اس ملک اور ریاست کے سیاسی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنے کی ذمہ داری آن پڑی ہے، اور یہ دلچسپ اتفاق ہے کہ دونوں رہنماؤں کو مختلف سطحوں پر تقریباً ایک جیسی صورت حال نے گوشۂ عافیت چھوڑ کر میدان عمل میں کود پڑنے کی تحریک دی۔ جے پرکاش نرائن نے انتہائی نامساعد حالات میں اور ناقابل بیان جسمانی صعوبتوں کے باوجود ملک کے سیاسی ڈھانچے میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کا اپنا خواب پورا کرلیا ہے۔ مولانا نے اپنا کام اب شروع کر دیا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر جے پرکاش نرائن وقت کے فرعونوں اور اقتدار کے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا کر تاریخ کے کوڑے دانوں (Dust Bins) میں پھینک دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ تو مولانا مسعودی اپنی بے پناہ اخلاقی قوت، اپنے بے داغ ماضی اور اپنی ملک گیر شہرت کے سہارے اس شہر کے مغرور خود پسند اور خود فریب سیاستدانوں کو راہ راست پر نہ لاسکیں، مولانا کا اس ضعیف العمری اور ناتوانی میں اپنے کندھوں پر اتنا بوجھ اُٹھانے پر آمادہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کے لئے موجودہ صورت اور سیاست ناقابل برداشت ہوگئی ہے اور وہ اپنی آنکھیں بند کرنے سے پہلے اُس قوم کی آنکھیں کھولنے کے لے کوشاں ہیں کہ جن پر شخصیات کا پردہ ڈال کر انکی بصیرت چھیننے کا کام ہم سب وقتاً فوقتاً انجام دیتے رہے ہیں۔ مولانا کی حالت ایک ایسے بُت تراش کی سی ہے کہ جس نے اپنی زندگی کا بیشتر اور بہترین حصہ ایک بُت تراشنے میں گذارا، اور جسے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس بُت کو توڑنے کا ناگوار فرض بھی سونپ دیا جائے، ہم

جانتے ہیں کہ مولانا کے قلب وجگر پر کیا گذری ہوگی۔ لیکن ہم ان کی اس اخلاقی جرأت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ وہ اپنے قلب وجگر سے زیادہ اپنے اِن لخت ہائے جگر کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہیں کہ جنہیں چالیس سال کی ریاضت اور عبادت کے بعد بھی یہ معلوم نہیں کہ وہ کدھر جارہے ہیں؟ قبلہ محترم جناب شیخ صاحب مولانا مسعودی کی اس گستاخی اور "بےادبی" پر سخت برہم ہوں گے۔

ستمبر ۱۹۷۶

بیسویں صدی کی موت

چیئرمین ماوزے تنگ کی موت کے بعد اُس کہکشاں کا آخری آفتاب غروب ہوگیا ہے، جس نے بیسویں صدی کو تاریخ عالم کی سب سے گرم نفس ولولہ انگیز، آتش نواء اور روشن صدی بنا دیا تھا، اس صدی کی ابتداء میں انقلاب کی شاہراہ کو ولادمیر لینن نے تابناک بنایا۔ پھر مصطفےٰ کمال، مہاتما گاندھی، ونسٹن چرچل، فرینکلن روز ویلٹ، جارج برنارڈ شاہ، علامہ اقبال، برٹنڈرسل، البرٹ آئینسٹائن، پیلوپکاسو، آرنلڈ ٹوائن بی، نکیتا کرسچوف، صدر ناصر، چارلس ڈیگال اور دوسری عظیم شخصیتوں نے ذہنی، سیاسی، فکری اور سائنسی انقلاب کی راہیں روشن کیں۔ ان میں ہر ایک اپنے اپنے خاص مدار کا آفتاب تھا، اور انہوں نے دنیا میں جو ذہنی اور سیاسی تہلکے پیدا کئے، اُن کی بازگشت صدیوں تک سنی جاتی رہے گی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی شخصیت ماوزے تنگ کی طرح ہمہ گیر اور پہلودار نہ تھی۔ ماؤ صرف اسی کروڑ چینیوں کے نجات دہندہ اور اُن کی اقتصادی آزادی اور سیاسی آبرو کے نشان، ہی نہیں تھے۔ وہ اس سے بہت زیادہ تھے، وہ انقلاب چین کے عاشق تھے اور انہوں نے خوابوں کی سنہری شعاعوں سے ایک نئے ملک کا تانا بانا بنا تھا اور یہ اُن کی شاعری کا خام مواد ہے۔ وہ اس انقلاب کے نظریہ ساز

تھے اور انہوں نے ایک عظیم مفکر اور مجدد کی جرأت فکر سے کام لے کر اپنے
عظیم پیشرو نظریہ سازوں، مارکس، لینن اور اسٹالین، کا یہ نظریہ مسترد کر دیا کہ
انقلاب کا ہراول دستہ صرف صنعتی شہروں کا پروقار طبقہ ہی ہو سکتا ہے۔ انہوں
نے دیہات اور دیہات کے کسانوں کو اپنے انقلاب کی آماجگاہ اور مجاہد بنایا
اور شہروں کو دیہات سے گھیرنے کا وہ فکری اٹم بم ایجاد کیا۔ جس نے آخر کو
من تانگ کی آہنی فصیل کو زمین بوس کر دیا۔ ماؤ اس انقلاب کے کمان دار
جرنیل اور قافلہ سالار بھی تھے انہوں ''لانگ مارچ'' میں اپنی محبوب بیوی کو
اپنے دوسرے سپاہیوں کے ساتھ انقلاب کی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ
کر دیا۔ انہوں نے گوریلا جنگ کو عالمی پیمانے کا ایسا طرز انقلاب بنایا جس
نے بڑی بڑی سلطنتوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ اور جنہوں نے بیسویں صدی کی
ہلاکت خیزیوں سے مسلط اتباع کے خلاف مظلوم قوموں کو جدوجہد کا نیا راستہ
دکھایا، ان سب پر طرہ یہ کہ وہ نئے چین کے معمار بھی تھے، اور وہ اس کی
آزادی کے پورے ۲۶ سال تک اس کی رہنمائی کر۔ تے رہے، چین جو کبھی
افیمچیوں اور سُست الوجود لوگوں کا وطن تھا۔ آج دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں
کو آنکھیں دکھا رہا ہے اور اُس نے سیاسی تہذیبی، سماجی اور اقتصادی میدان
میں اپنی ایسی توقیر قائم کر لی ہے کہ دنیا کی عظیم ترین طاقتیں بھی اُس کی ایک
ہلکی سی مسکراہٹ پر جان نچھاور کر لیتی ہیں۔ جب ۱۹۵۸ء میں ماؤ کو محسوس
ہوا کہ روس تیکنکی اور اقتصادی مدد کے بہانے اُس کی آزادئ فکر اور انقلابی
حریت پر اثر انداز ہونا چاہتا ہے تو ماؤ نے کسی لیت ولعل کے بغیر روس کی تمام

امداد کو مسترد کر دیا۔ اور چینی قوم کو خود اعتمادی کا عظیم درس دیا۔ سودیت یونین کا خیال تھا کہ چین اپنے مسائل کے بوجھ کے تحت دب کر رہ جائیگا۔ لیکن حالات گواہ ہیں کہ سودیت لیڈروں کے تمام اندازے غلط ثابت ہو گئے، تمدنی انقلاب کا عظیم معرکہ سر گرم کرنا ماوزی تنگ کی جرأت اور شجاعت کا سب سے حوصلہ مند اظہار تھا، کیونکہ ہزاروں سال کی رسوم وقیود کے خلاف جہاد سامراج سے جہاد کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے، اس انقلاب میں کچھ زیادتیاں بھی ہوئی ہوں گی، لیکن ماؤ کا مقصد چینیوں کو سچے معنوں میں انقلابی بنانا تھا اور اس انقلاب کو سماج کے دِل میں جاگزیں کرنا تھا۔ چھوت چھات اور توہمات نے ہندوستان کی آزادی کو بھی گہنا دیا ہے، لیکن ہم ابھی تک کوئی تمدنی انقلاب برپا نہیں کر سکے، کیونکہ ہم ماوزی تنگ کی عظمت اور جرأت کا رہنما پیدا نہیں کر سکے ہیں، ماوزی تنگ ایک شاندار اور تقدیر ساز زندگی گذار کر تاریخ کی عظمتوں میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ لیکن نیا چین انکی یادگار کے طور پر قائم ہے اور یہ بات بھی ماؤ کی عظمت کا ایک اور پہلو آشکار کرتی ہے کہ اب اس کے بعد اس کا کوئی بیٹا اپنے باپ کا نام بیچ کر عوام کی گردنوں پر سوار ہونے کیلئے موجود نہیں کیونکہ ماؤ کوریا کی جنگ میں اپنے لخت جگر کو بھی قربان کر چکا تھا۔ نہ ماؤ کی جائیداد اور محلات کی فہرست دنیا کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرے گی۔ ماؤ آخری عمر تک ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرتا رہا اور وہ ایک سچے کرم یوگی کی طرح نسل انسانی اور چینی قوم کو آزادی فکر ونظر سے ہمکنار کرنے کی سعی کرتا رہا۔

نومبر ۱۹۷۷

ایں سعادت بزور بازو نیست

پنڈت نہرو کی ہمشیرہ مسز وجے لکشمی پنڈت کی صاحبزادی نین تارا سہگل ایک بہت اچھی ادیب اور مضمون نگار ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور ان کے مضامین آئے دن اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ ابھی چند دن قبل انگریزی روز نامے ''انڈین ایکسپریس'' میں جیوتی باسو کا کلکتہ کے عنوان سے ان کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کلکتہ سے دہلی کے ہوائی سفر میں، مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر جیوتی باسو سے اپنی ملاقات کا احوال بیان کیا ہے۔ مسز سہگل کا کہنا ہے کہ کلکتہ سے دہلی تک کسی کو یہ معلوم ہی نہیں تھا، کہ مغربی بنگال کے چیف منسٹر ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے ہیں اور جب پالم ہوائی اڈہ پر جہاز رُکا، تو مسٹر باسو دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز سے اُتر کر انڈین ایر لائنز کی اس بس میں بیٹھ گئے، کہ جو سواریوں کو جہاز سے ٹرمینل بلڈنگ تک پہنچاتی ہے ان کے ہاتھ میں ایک بریفک کیس تھا اور بغل میں ایک چھوٹی صندوقچی، اور وہ نین تارا کے ساتھ والی اس سیٹ پر اس سادگی اور اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ کسی کو وہم و

گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ وہ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ہیں۔ نین تارا کو یہ بات دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وزیر اعلیٰ کے ساتھ نہ کوئی خصوصی عملہ تھا۔ اور نہ ان کی پذیرائی کے لئے درجنوں افسروں پر مشتمل قافلہ ہوائی اڈے پر موجود تھا۔ اور ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں یہ ان کا پہلا تجربہ ہے کہ جب کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ ایک عام مسافر کی طرح سفر کرتا ہوا دیکھا گیا۔ مسز سہگل نے اس ایک معمولی واقعے کے بیان سے ہمارے حکمرانوں کی اس اداکاری اور ریاکاری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس کے بل بوتے پر وہ مسند اقتدار پر براجمان ہوتے ہی سادگی، قناعت، شرافت اور اخلاقیات کے وہ سارے درس بھول جاتے ہیں کہ جنہیں دہرا دہرا کر وہ اقتدار کے شیش محلوں میں پہنچ جاتے ہیں اقتدار کی اس نمائش اور شاہ وحشمت کے اس مظاہرے میں بنیادی طور پر ہمارے حکمرانوں کے احساس کمتری کا دخل ہوتا ہے اور اسی لئے عوام کی توجہ مبذول کرنے اور اپنی اہمیت جتانے کے لئے ہمارے وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزیر بڑے کروفر اور دھوم دھام سے سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ جیوتی باسو، نمبودری پدیا اچھوتا منین جیسے لوگ بنیادی طور پر ایک نظریے اور عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان کا اقتدار بجائے خود مقصد نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس لئے ایسے لوگ اقتدار کے مسندوں پر بیٹھ کر نہ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ اور نہ اپنے نظریات، اس کے برعکس ہمارے اکثر سیاسی لیڈروں کے لئے اقتدار بجائے خود ایک منزل کو پانے کے بعد اس کے

مظاہرے اوراس کی آسائشوں پر دل وجان سے فدا ہوتے ہیں۔ ریاست
جموں وکشمیر کے عوام ابھی تک یہ بات نہیں بھولے ہیں کہ ہمارے محبوب رہنما
اور قائد اعظم جناب شیخ محمد عبداللہ نے وزارت عظمیٰ کی باگ ڈور سنبھالتے
ہی اپنی سرکاری گاڑی کے آگے ایک سائرن بجاتی ہوئی جیپ کا بھی اہتمام
کیا تھا۔ تاکہ عوام الناس کو معلوم ہو کہ ان کا قائد سرکاری گاڑی میں کروفر کے
ساتھ جارہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ عوام میں دو سال تک مذاق اور طنز کا
موضوع بننے کے بعد اب یہ قیامت ختم کردی گئی ہے۔ لیکن شیخ صاحب اور
ہمارے دوسرے وزیروں کو ابھی جیوتی باسو کی بلندی اور بے نیازی تک پہنچنے
میں بہت وقت لگے گا جیوتی باسو بننے کے لئے صرف وزیر اعلیٰ بننا ہی کافی
نہیں اپنے آپ کو ملک کے غریب اور مفلوک الحال عوام سے ہم آہنگ کرنا
بھی ضروری ہے اور وہ لوگ جو اپنے ذاتی مکانات میں رہنے کے باوجود
سرکار سے مکان اور فرنیچر کا بھاری کرایہ وصول کرتے ہوں درویشی، قناعت
اور سادگی کی اس منزل تک کبھی پہنچ ہی نہیں پائیں گے کہ جو جیوتی باسو جیسے
لوگوں کو دوسری ریاستوں کے وزیر اعلیٰ سے مختلف اور ممتاز بناتی ہے۔

اگست ۱۹۷۶

آوارہ کتوں کی فیملی پلاننگ

ایک عام اندازے کے مطابق سرینگر کے صدر اسپتال میں ہر روز اوسطاً بارہ ایسے زخمیوں کا علاج کیا جاتا ہے کہ جو آوارہ کتوں کی بڑھتی ہوئی شرانگیزی کا نشانہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بروقت علاج کی وجہ سے بچ جاتے ہیں۔ لیکن کچھ بدقسمت معمولی سی تاخیر کی بناء پر بے موت مرجاتے ہیں۔ بچوں کے ایک معالج نے پچھلے دِنوں ہمیں ایک بچے کی افسوسناک موت کا واقعہ سنایا۔ جو ارباب اقتدار اور دوسرے ذمہ دار متعلقین کے لئے درس عبرت ہونا چاہیے۔ معلوم ہوا کہ اس بچے کا تعلق اننت ناگ سے تھا۔ اور ایک ہفتہ قبل ایک آوارہ کُتے نے اسے کاٹا تھا۔ دو چار دن تک یہ معلوم نہیں ہوسکا، کہ کُتا پاگل تھا یا نہیں اور اس دوران بچے کے والدین سب کچھ بھول گئے، ہفتہ بھر بعد بچہ ہائیڈروفوبیا میں مبتلا ہوکر مر گیا۔ ڈاکٹر کے بیان کے مطابق اس قسم کے واقعات وادی میں عام طور پر دیکھنے میں آتے ہیں اور ہر روز کوئی نہ کوئی معصوم بچہ آوارہ کتوں کی آوارگی کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔ آوارہ کتوں کے بارے میں چونکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں سے کون

کس وقت پاگل ہے اور کس وقت ٹھیک ہے۔ اس لئے جب تک ان کا کاٹا جان لیوا ثابت نہیں ہوتا، عام طور پر ان کی گندگی، آوارگی اور ایذا رسانی کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔

سوال یہ ہے کہ آوارہ کتوں کی اس بڑھتی ہوئی فصل کو روکنے کی صورت ہے یا نہیں اور اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ ہمارا خیال یہ ہے کہ جس ملک میں انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کیلئے کروڑوں روپے صرف اس لئے خرچ کیا جا رہا ہے کہ عام انسانوں کو بہتر زندگی گذارنے کے مواقع حاصل ہوں۔ اس ملک میں آوارہ کتوں کی آبادی میں اضافے کی اجازت کیوں کر دیجا سکتی ہے؟ کیا اس ملک میں کتے انسانوں سے زیادہ معتبر اور محترم قرار پائے ہیں اور کیا ان کی فیملی پلاننگ میں کوئی مذہبی مسئلہ درپیش ہے؟ اگر نہیں، تو پھر ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ سرینگر اور وادی کے ہر حصے میں آوارہ کتوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کی کوئی تدبیر کیوں نہیں کی جا رہی ہے۔ دہلی، بمبئی اور ملک کے دوسرے شہروں کی تو بات رہنے دیجئے، وہاں مشکل سے کسی سڑک پر کوئی آوارہ کتا نظر آتا ہے۔ لیکن جموں کا شہر بھی اس اعتبار سے خاصا صاف ستھرا شہر ہے، وہاں بھی آوارہ کتوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن سرینگر، اننت ناگ، بارہمولہ، سوپور، پٹن، بجبہاڑہ اور دوسرے قصبوں میں انسانوں سے زیادہ آوارہ کتے دکھائی دیتے ہیں اور یہی عالم دیہات کا بھی ہے۔ ہمارے خیال میں سرینگر میں آوارہ کتوں کی پوری نسل کو ختم کرنے کی ذمہ داری سرینگر کی میونسپل کمیٹی

پر ہے اور اسی طرح قصبوں میں یہ کام وہاں کی ٹاؤن ایریا کمیٹیوں اورنوٹیفائیڈ ایریا کمیٹیوں کے سپرد ہے اور آوارہ کتوں کی خوف ناک بڑھتی ہوئی تعداد جو انسانی جان کے لئے ایک مستقل خطرہ بن رہی ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ سرینگر کی میونسپل کمیٹی اور دوسری متعلقہ کمیٹیاں اپنے اس فرض کی انجام دہی میں بُری طرح ناکام رہی ہیں اور ان کی نگاہوں میں غالباً اس مسئلے کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے کہ جس کا یہ مستحق ہے ہم اور لوگوں کے بارے میں تو نہیں جانتے، لیکن میونسپل کونسل سرینگر کے چیرمین مسٹر غلام محمد باون کے متعلق یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں صرف آوارہ کتوں سے ہی نہیں، آوارہ انسانوں سے بھی سخت نفرت ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ آوارہ کتوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں تاخیر سے کام لے رہے ہیں تو یقیناً اس میں کوئی سیاسی مصلحت ہوگی ہم اس سلسلے میں ان کے ردِ عمل کا انتظار کرینگے۔

فروری ۱۹۷۷

مادرمہربان کو
بلا مقابلہ کامیاب بنائیے

ریاست کے لئے عام انتخابات کا اعلان ہونے کے بعد پچھلے ہفتے جب میں پہلی بار سرینگر آیا تو میں نے شہر کی سیاسی صورت حال کو خاصا دلچسپ پایا۔ مجھے یہ جان کر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ سرینگر کی پارلیمانی نشست کے لئے میری جگہ بیگم شیخ محمد عبداللہ کی نامزدگی سے میرے بہت سے سیاسی اور ذاتی مخالفین کو بڑی مسرت ہوئی ہے اور ان میں سے ہر شخص اسے اپنی ذاتی کامیابی اور کارنامہ تصور کر کے اسے میری سیاسی موت سے تعبیر کر رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جان کر مجھے ایک خوشگوار حیرت کا بھی احساس ہوا، کہ بہت سے ایسے لوگ، کہ جن کے ساتھ میرا کوئی ذاتی تعلق یا رابطہ نہیں تھا، اس انتخاب سے خوش نہیں ہیں۔ اور وہ صحیح یا غلط، میری تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود پارلیمنٹ میں کشمیر کی نمائندگی کے لئے آج بھی مجھے ہی سب سے زیادہ موزوں اُمیدوار سمجھتے ہیں۔ بہر حال موجودہ حالات میں یہ بحث غیر متعلق بھی ہے اور غیر ضروری بھی، اور اصل دلچسپی اور

توجہ کا موضوع یہ ہے کہ سرینگر کی پارلیمانی نشست کے لئے نیشنل کانفرنس اُمیدوار کا مقابلہ کون کرتا ہے؟ اور یہ مقابلہ کس نوعیت کا ہوگا؟ سرینگر میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں نے محسوس کیا، کہ شہر کے سیاسی سماجی اور عوامی حلقوں میں اس موضوع سے بڑی گہری دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے اور شہر کے ہر گھر ہر دکان اور ہر چوراہے پر اس سوال پر لے دے ہورہی ہے عام حالات میں بیگم شیخ محمد عبداللہ کی نامزدگی کا اعلان، ان کی انتخابی مہم کا آغاز بھی ہونا چاہیے تھا اور اس کا حرف آخر بھی۔ کیوں کہ ان کی ذات کے تیئں اہلیان کشمیر کے دلوں میں بے پناہ محبت اور تقدس کا جذبہ موجود ہے۔ ایک مدت سے یہاں کے لوگ انہیں مادر مہربان کے شفقت بھرے نام سے یاد اور مخاطب کرتے آئے ہیں۔ اور آج بھی ریاستی عوام کی اکثریت، عزت واحترام ہے ان کا نام لیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر بعض حلقوں میں ان کے مقابلہ کے امکانات پر غور اور کہیں کہیں ان کے خلاف اُمیدوار کھڑا کرنے کی خفیہ تیاریاں ہورہی ہیں۔ تو اس کا سبب بیگم صاحبہ کے تیئں کسی قسم کی مخالفت یا مخاصمت کا جذبہ نہیں شیخ صاحب کی ذات اور انکی حکومت کے خلاف ناراضگی اور احتجاج کے مظاہرے کی دبی ہوئی مگر شدید خواہش ہے...... یہ جذبہ اور یہ خواہش اتنی شدید ہے کہ مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ اگر اب کی بار بھی میں شیخ صاحب کے نمائندے کی حیثیت سے سرینگر سے انتخاب لڑتا، تو نہ صرف یہ کہ مجھے سخت ترین مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا۔ بلکہ میری کامیابی کے امکانات بھی مخدوش تھے۔ ۱۹۷۱ء

تشویش اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اور اس ساری بیزاری اور ناراضگی کو بیگم صاحبہ کے خلاف استعمال کرنے کی کوششیں منظّم کی جا رہی ہیں۔ ان کوششوں میں شیخ صاحب کے بہت سے قریبی ساتھی اور حد یہ ہے کہ ان کی جماعت کے کئی بارسوخ افراد بھی خفیہ طور سرگرم عمل ہیں...... ان کی یہ کوششیں کامیاب ہوں گی یا نہیں؟ اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا، لیکن ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مادرِ مہربان بنیادی طور پر ایک شریف النفس، عبادت گزار اور قابل احترام خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے کردار کی پاکیزگی، اخلاق کی بلندی اور اپنی نیک سرشت سے ریاستی عوام کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بنائی ہے۔ شیخ صاحب کی سیاست اور ان کے اسٹائل سے اختلاف رکھنے والے بھی بیگم صاحبہ کی عزت کرتے ہیں۔ اور ان کی نیک سیرتی کا اعتراف کرتے ہیں ...... وہ ہمارے تمدن، ہماری روایات اور ہمارے معاشرے کی نمائندہ ہیں۔ وہ مشرقی مزاج اور مغربی تہذیب کا ایک صحت مند امتزاج ہیں۔ اور شیخ صاحب کی رفیقۂ حیات کی حیثیت سے انہوں نے ایک مثالی بیوی کا کردار پیش کیا ہے اور ان کی ذات اور ان کی شخصیت ہم سب کے لئے قابلِ احترام اور باعث عزت ہے۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ شیخ صاحب، ان کی سیاست اور ان کی حکومت کو بیگم صاحبہ سے منسوب نہ کیا جائے۔ اور ان کی ذات کو انتخابی معرکہ آرائی کا موضوع نہ بنایا جائے ...... شیخ صاحب کی حکومت کی بعض پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے اور بھی بہت سے

مواقع آئینگے ۔اس لئے شرافت اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کی ذات کو اس مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے وہ بنیادی طور پر سیاسی شخصیت نہیں ہیں اور انہیں ہمیشہ بعض مجبوریوں کی بناء پر سیاسی میدان میں آنا پڑا ہے ۔اب کی باران کے سیاسی میدان میں آنے کا سبب یہ ہے کہ سرینگر کی انتخابی نشست کے لئے نیشنل کانفرنس کو اس سے زیادہ محفوظ اور موزوں اُمیدوار دستیاب نہیں ہوسکا۔ ورنہ مجھے اس بات کا ذاتی علم ہے، کہ وہ اس معرکہ آرائی میں نہیں پڑنا چاہتی تھیں۔ اس پس منظر میں، میں ضلع سرینگر کے تمام رائے دہندگان سے بصد خلوص یہ اپیل کرتا ہوں۔ کہ وہ بیگم صاحبہ کے مقابلے میں کوئی اُمیدوار کھڑا نہ کریں۔اور بیگم صاحبہ کو بلا مقابلہ کامیاب کر کے ان کے تئیں اپنے جذبہ عزت واحترام کا ثبوت دیں۔میری خواہش ہے کہ ساری دنیا کو معلوم ہو، کہ ریاستی عوام شیخ صاحب سے ذاتی اور سیاسی اختلافات رکھنے کے باوجود خواتین کا بالعموم اور ان کی بیگم صاحبہ کا بالخصوص بے حد احترام کرتے ہیں!

بے پر کی!

ار جناب شیخ محمد عبداللہ نے آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ سے ''آئینہ'' کی سال گرہ کے موقع پر مدیر ''آئینہ'' کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا ہے:۔

''لوگ اپنی اور اپنے بچوں کی سالگرہ مناتے ہیں اور آپ نے اخبار کی سالگرہ منانے کی رسم ایجاد کی ہے۔ خدا آپ کے ''آئینہ'' کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ کوڈے کنال میں اخبار باقاعدگی سے ملتا رہا، اور آپ کی دلچسپ تحریروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب سے انسٹی چیوٹ میں آیا ہوں۔ ''آئینہ'' نہیں دیکھا ہے۔ لیکن اُمید ہے کہ آپ دستور حق گوئی و بے باکی سے کام لے کر کشمیر کے مظلوم عوام کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہوں گے، چودھری شفیع کی معرفت معلوم ہوا کہ آپ نے میرے نام تازہ اشاعت میں ایک کھلی چھٹی لکھی ہے ۔انہوں نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ میں تو صرف یہ دُعا کروں گا کہ خدا آپ کو ایمانِ کامل عطا کرے میری صحت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔''

۲/ وزیر خزانہ شری درگا پرشاد در، جو حالیہ عام انتخابات میں اپنے تین اُمیدواروں کی ضمانتیں ضبط کرواکر کامیاب ہوگئے ہیں۔ آج کل وادی کا دورہ فرمارہے ہیں۔ کاپرن (تحصیل کولگام) میں ۲۱۷ عوام، جن میں ۸۷ کے قریب سرکاری ملازم بھی شامل تھے، سے خطاب کرتے ہوئے وزیر خزانہ نے کئی سنسنی خیز انکشافات کئے۔ انہوں نے کہا کہ شوپیان کے لوگوں نے شمیم احمد شمیم کو ووٹ دے کر اپنے آپ کو راشن کے حق سے محروم کردیا ہے۔ لیکن اب انہیں نارواو کے بلا مقابلہ کامیاب کانگریسی ممبر عبدالعزیز زرگر کی سفارش پر راشن دیا جارہا ہے۔ اس انکشاف پر کاپرن یوتھ کانگریس کے ایک ممبر نے بڑی معصومیت کے ساتھ دریافت کیا۔ ''قصبوں اور دیہات میں تقسیم کیا جانے والا راشن آپ کے گھریلو ذخیروں میں سے آتا ہے یا بیرون ریاست سے؟'' ہماری اطلاع کے مطابق زرگر صاحب نے اس سوال کا بہت بُرا منایا اور انہوں نے حاضرین سے مخاطب ہوکر کہا کہ ''آپ لوگوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ڈی، پی در صاحب خاندانی جاگیردار اور غلہ دار ہیں اور اسی لئے صادق صاحب نے انہیں اس ریاست کا وزیر خوراک مقرر کرکے عوام کا بیڑا غرق کردیا ہے۔''

(تالیاں)

۳/ ۳ جولائی کو بیگم عبداللہ کی آمد پر سرینگر میں محکمہ سراغرسانی کے ناظم اعلیٰ نے دہلی میں اپنے سربراہ کے نام وائرلیس پر جو اطلاع بھیجی۔

اتفاق سے اس کی ایک کاپی ادارے کے ہاتھ لگ گئی، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

''بیگم عبداللہ آج صبح سرینگر پہنچ گئیں۔ ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال کرنے کیلئے ان کی بیٹی خالدہ اور خواجہ علی شاہ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ گھر جانے کیلئے ان کے پاس کوئی ٹرانسپورٹ بھی نہ تھا، پھر خواجہ علی شاہ نے کہیں سے ایک ٹوٹی پھوٹی جیپ لائی اور بیگم عبداللہ چپکے سے اس میں بیٹھ کر شہر روانہ ہوگئیں۔ جیپ کی چھت چونکہ ٹوٹ گئی تھی، اس لئے کچھ لوگوں نے رستے میں پتھر پھینکے، لیکن حفاظتی دستوں کی بروقت مداخلت سے کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔ ہماری اطلاع ہے کہ بیگم بہت پریشان ہیں کہ وہ کشمیر کیوں آئیں کیونکہ یہاں لوگوں نے انہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ شیخ عبداللہ کیساتھ یہاں کوئی نہیں، لیکن پھر بھی اس کی رہائی خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے اپنے اہلکاروں کو ہدایت کی ہے کہ بیگم کے خلاف فرضی الزامات کی فہرست مکمل کریں۔ تاکہ انہیں پھر اپنے شوہر کے پاس بھیجنے میں آسانی ہو، باقی خیریت۔''

۴ر بخشی غلام محمد کے خلاف آئینگر کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے بخشی صاحب کے برادر اصغر بخشی عبدالمجید نے ہمارے نمائندے سے کہا کہ ''انجمن برادران بخشی'' اس رپورٹ کا خیر مقدم کرتی ہے، کیونکہ رپورٹ سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ بخشی غلام محمد نے اپنے

بھائیوں پر کوئی احسان نہیں کیا ہے اور ہم لوگ مفت میں بدنام ہو گئے ہیں، کمیشن کی رپورٹ سے صاف ظاہر ہے کہ ہم لوگوں نے اپنی محنت اور ریاضت سے دولت پیدا کی ہے اور بخشی صاحب نے جتنی دھاندلیاں کی ہیں وہ اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے کی ہیں بخشی عبدالمجید نے مسٹر آئین گر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ اتنا انصاف پسند اور عادل جج ثابت ہوگا۔

۲

پچھلے دنوں ایک مقامی عدالت میں ایک بطخ کی چوری کے سلسلے میں وکیلوں کے وارے نیارے ہوگئے۔ فریقین نے بڑے بڑے وکیلوں کو آپس میں ٹکرا کر میاں بطخ کو سیاسی اہمیت عطا کردی۔ قیاس غالب ہے کہ بطخ چور کی ضمانت کی مخالفت اور موافقت میں ہزاروں رروپے صرف ہوگئے۔ جب ایک من چلے نے یہ انکشاف کیا کہ بطخ چور کانگریسی کارکن ہے تو ایک حاضر جواب کانگریسی نے جواب دیا کہ ہے تو کانگریسی؛ لیکن محاذ رائے شماری سے ہی بھاگ کے آیا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق بطخ نے عدالت میں بیان دینے سے انکار کردیا ہے۔ بطخ کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ میاں بطخ نے اپنا بیان سپریم کورٹ کے لئے محفوظ کردیا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ بطخ دراصل پاکستانی جاسوس ہے!

....

ریاست میں سیکولرازم، رواداری اور بھائی چارے کی روایات کا ذکر کرتے ہوئے ایک راہ چلتے مورخ نے نہایت عمدہ مثال پیش کی۔ موصوف نے کہا کہ لیمرٹ لین سرینگر میں بخشی عبدالمجید کی سہ منزلہ عمارت موجود

ہے۔ یہ عمارت مجید صاحب نے اپنے برادر محترم کے دورِ حکومت میں بنائی اور اس لحاظ سے اسے بخشی صاحب کی بدعنوانیوں کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔ اسی مکان کی دوسری منزل میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے سگے بھتیجے شیخ عبدالرشید نے اپنی فرم کا دفتر کھولا ہے اور وہ اس کا کرایہ بخشی عبدالمجید کو ادا کر رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر تجارت اور کاروبار کے سلسلے میں ''حق خودارادیت'' کا کوئی دخل نہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سیاسی لڑائیاں اور دشمنی تو عام کارکن کی ذمہ داری ہے، لیڈروں اور رشتے داروں کو اس سے کیا تعلق؟

....

کشمیری کلچر کا ''کاروبار'' کرنے والی واحد فرم'' کامل، راہی، سنتوش اینڈ کمپنی'' نے پریم ناتھ بزاز کی کلچرل سوسائٹی کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ فرم کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ بزاز صاحب پہلے یہ بتائیں کہ انہوں نے کتنی کہانیاں لکھی ہیں، کتنی نظمیں کہی ہیں اور کتنی تصویریں بنائی ہیں؟ اور پھر کلچر سے اپنی وابستگی کا اظہار کریں۔ راہی نے بزاز صاحب پر الزام لگایا ہے کہ وہ دراصل کلچر کے پس پردہ یہاں ہندوستان کا پروپگنڈا کرنا چاہتے ہیں (معاصر مارتنڈ'' کا خیال ہے کہ دراصل پاکستانی پروپگنڈا کرنا چاہتے ہیں) کامل اور سنتوش کا کہنا ہے کہ وہ اسی سال قانون ساز کونسل میں کلچرل نشست کیلئے منتخب ہونے والے تھے۔ بزاز صاحب کی کلچر بازی سے ان کا سارا جوڑ توڑ دھرے کا دھرارہ جائے گا۔ اس لئے پریم ناتھ بزاز کو ریاست

بدر کر دینا چاہیے۔

ابھی تک عوام کو یہ غلط فہمی تھی کہ پاکستانی مداخلت کاروں کو ہندوستانی فوج کے بہادر سپاہیوں نے مار بھگایا۔ لیکن حکومت نے یہ غلط فہمی دور کر دی ہے۔ سرکاری اعلان کے مطابق مداخلت کاروں کی پیش قدمی روکنے اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنانے کا سہرا ان ۴۰۴ افسروں کے سر ہے۔ جنہیں ان کی اعلیٰ خدمات کے عوض نقدی انعامات سے نوازا گیا ہے۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اگر وزیروں کے پی اے سٹینو گرافر، چپراسی، جمعدار اور ڈرائیور دشمن کو شکست دینے میں رات دن ایک نہ کرتے تو اس وقت سکریٹریٹ پر ''مجاہدین کشمیر'' کا جھنڈا لہراتا ہوتا۔ ایک اطلاع کے مطابق چیف سکریٹری نے چیف منسٹر کو یہ تجویز پیش کی ہے کہ ان ۴۰۴ افسروں پر مشتمل ایک طوفانی دستہ منظم کیا جائے جو نہ صرف پاکستانی حملے کے خلاف ایک مستحکم ضمانت ہوگا بلکہ چینی جارحیت کو بھی روک سکے گا۔

....

محکمہ اطلاعات کے جن ۲۶ افسروں کو ''تمغۂ شجاعت'' دیا گیا ہے، ان میں سے اکثر افسر ایمرجنسی کے دوران دفتر میں بیٹھ کر دن بھر ''وودھ بھارتی'' کا پروگرام سنتے تھے۔ ایک ستم ظریف افسر نے کہا کہ اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ دن بھر ''وِودھ بھارتی'' سننے کا ۵۰۰ روپے نقد ملے گا تو میں دوسرے ریڈیو پر ریڈیو سیلون کا پروگرام بھی سنتا!

۳

۱۔ قارئین کو شاید معلوم نہ ہو کہ یہ خاکسار کمترین پچھلے ہفتے دہلی گیا تھا۔ دلی سے وہ اپنے لئے دو نائیلاں موزے، ایک پیکٹ بلیڈ اور کچھ اُردو رسایل لے آیا۔ قارئین ''آئینہ'' کے لئے دو دلچسپ لطیفے لایا ہوں۔ جو پیشِ خدمت ہیں۔ ایک شام انڈیا گیٹ کے قریب ۱۹، ۲۰ کا ایک لڑکا باآواز بلند چیختا جا رہا تھا۔ ''آٹھ آنے میں روپے بنانے کی مشین، آٹھ آنے خرچ کیجئے اور لکھ پتی بن جائیے۔ حیرت انگیز ایجاد، آٹھ آنے میں روپے کمانے کی مشین'' ...... لڑکے کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گذرا، تو میں نے اُسے روک کر کہا'' کہاں ہے مشین؟ ''آٹھ آنے دیجئے، اور لیجئے،'' اس نے جواب دیا۔ صرف اپنے تجسس کو آسودہ کرنے کیلئے میں نے اُسے آٹھ آنے دیئے۔ اس نے جھٹ سے بکس کھول کر میرے ہاتھ میں ایک سفید گاندھی ٹوپی تھما دی۔ یہ لیجئے اپنی مشین'' ...... یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اور میں اس کی ذہانت پر بہت دیر تک داد دیتا رہا۔

۲۔ انگریزی روزنامہ ''سٹیٹسمین'' کے باہر دیوار پر یہ الفاظ لکھے ہوئے

پائے۔

''دیکھئے گدھا پیشاب کررہا ہے''...... میرا خیال ہے یہ عبارت ''یہاں پیشاب کرنا منع ہے'' سے زیادہ 'موثر اور مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

....

پچھلے ہفتے جب میڈیکل کالج کے سالانہ دن منانے پر ٹیگور ہال میں تمدنی پروگرام چھ بجے کے بجائے سات بجے پیش کیا گیا۔ تو میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے ایک نامعقول آدمی نے ایک بڑی معقول بات کہی۔ انہوں نے فرمایا...... ''یہ ڈاکٹر لوگ یہی کچھ مریضوں کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ انہیں آپریشن ٹیبل پر لٹا کر خود رمی کھیلنا شروع کرتے ہیں۔ اب دیکھئے ہمیں یہاں ہال میں بٹھا کر خود کہیں خوش گپیّوں میں مصروف ہیں۔'' میرا خیال ہے کہ نامعقول صاحب کی بات میں بڑا وزن ہے۔ اگر ایک ڈاکٹر ایک گھنٹے کی قدر و قیمت نہیں سمجھتا، تو وہ انسان کی زندگی کی قدر و قیمت کیوں کر سمجھے گا؟

....

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اب کی بار ''آئینہ'' بال بال بچ گیا۔ ''آئینہ'' کی گذشتہ اشاعت میں شائع شدہ اداریہ ''فیصلہ کن مرحلہ'' کا بہت سے نازک مزاج ممبران اسمبلی نے بہت بُرا منایا تھا۔ خواجہ شمس الدین کی قیادت میں بعض منابرین (جمع ممبران کی) اسمبلی مدیر ''آئینہ'' کے خلاف مراعت شکنی کی تحریک پیش کرنے ہی والے تھے، کہ انہیں یاد آیا کہ یہ اسمبلی تو

اب ''رفتنی'' ہے، کیوں خواہ مخواہ ''آئینہ'' کے ساتھ جھگڑا مول لیا جائے۔

....

جب اس نمائندے نے ہوم سکریٹری شری غلام رسول رینزو سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ وہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر انتخابات لڑ رہے ہیں، تو انہوں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر اس گمراہ کن شر انگیز اور فتنہ پرور خبر کی تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ جلد ہی عدالت میں جا کر ایک بیان حلفی دیں گے کہ وہ مرتے دم تک سرکاری ملازم رہیں گے۔ اور کبھی کوچہ سیاست کا تصور بھی ذہن میں نہ آنے دیں گے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں اپنے بچوں کے نام وصیت کروں گا۔ کہ سب کچھ کرنا سیاست میں حصہ نہ لینا۔

....

برج کشن پنچی سابق جرنلسٹ حال گمشدہ کے دوستوں نے پولیس میں ان کی پُر اسرار گمشدگی کے متعلق رپورٹ درج کرائی ہے۔ کہ عرصہ چار ماہ سے پنچی صاحب لاپتہ ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ایک صبح وہ دریائے جہلم پر اشنان کرنے لگے۔ اور اس کے بعد واپس گھر نہیں آئے۔ بعض قیافہ شناسوں کا کہنا ہے کہ پنچی صاحب یا تو جہلم میں بہہ گئے، یا ہوائی جہاز پر سوار ہو کر کلکتہ پہنچ گئے۔ ادھر ان کے جانے کے بعد سے ''انڈین آبزرو'' میں کشمیر کی رنگین راتوں سے منسوب کوئی ''کہانی'' شائع نہیں ہوئی ہے۔

....

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا۔ کہ ریاستی پولیس کا ایک افسر ایک مقامی عدالت سے توہین عدالت کے جرم میں سزا پانے اور ایک عورت کی عصمت دری کرنے کی کوشش کے الزام میں ماخوذ ہونے کے باوجود اپنے عہدے پر بڑی آب وتاب کے ساتھ تعینات ہے۔ حالانکہ قواعد کی رُو سے اسے بہت پہلے معطل ہو جانا چاہئے تھا، معلوم ہوا ہے کہ وزیر اعلیٰ نے اس ضمن میں انسپکٹر جنرل پولیس سے کہا ہے کہ وہ اس پولیس آفیسر کو ایک نظر دیکھنے کے شوقین ہیں۔ جو اتنا زبردست، بارسوخ اور باوقار ہے۔ کہ سزا کھانے کے بعد بھی قانون کا محافظ بنا بیٹھا ہے۔

....

ریاستی سی آئی ڈی مرکزی نیشنل انٹلی جنس کے اشتراک سے ریاست میں ایک اور سیاسی پارٹی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے غلط اُردو لکھنے والے بعض اخبارات کے ایڈیٹروں سے خطاب کرتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا کہ ابھی تک اس سیاسی جماعت کا مکمل حدود اربعہ اور جغرافیہ معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن اس کے انجر پنجر سے معلوم ہوا ہے کہ یہ شاید پرجا سوشلسٹ پارٹی کا ڈھانچہ ہے۔ اس سلسلے میں پیارے لال کول وکیل سے پوچھ گچھ جاری ہے۔

۴

جن دنوں صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں نے نیشنل کانفرنس سے الگ ہو کر ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس قائم کی تھی۔ان دنوں کسی سرکاری ملازم سے انتقام لینے کی ایک نئی صورت ایجاد ہوئی تھی چپکے سے بخشی صاحب یا بخشی رشید سے یہ کہہ دیا جاتا کہ فلاں سرکاری ملازم ''اندر'' سے صادق صاحب کا حامی ہے۔بس پھر کیا تھا۔سرکاری ملازم پر بلا ہائے نا گہانی ٹوٹنا شروع ہو جاتیں۔کبھی تبادلہ، کبھی معطّلی، کبھی جواب طلبی ...... بخشی صاحب کے دوبارہ سیاست میں نمودار ہونے کے بعد اس نسخے کو ایکبار پھر بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا ہے۔اگر کوئی دیانتدار آفسر آپ کی بات نہیں مانتا۔اگر آپ کو اس کا کوئی پرانا قرضہ چکانا ہے۔یا آپ اپنے کسی عزیز کی راہ کا کانٹا ہٹانا چاہتے ہیں۔تو آفیسر کے خلاف قاسم صاحب، کار صاحب یا براہ راست صادق صاحب تک یہ بات پہنچایئے۔کہ وہ ''اندر'' سے بخشی صاحب کا حامی ہے یا یہ کہ اس نے بخشی کنونشن کے لئے

چندہ دیا ہے۔ پھر دیکھئے کیا ہو جاتا ہے۔

....

سری کنٹھ رینہ ٹریڈ کمشنر کے متعلق یہ ناچیز کسی حسنِ ظن میں مبتلا نہیں ہے۔ لیکن ابھی پچھلے دنوں رینہ صاحب کے ایک ایسے کارنامے کی اطلاع موصول ہوئی کہ بذریعہ ٹیلی فون ان کی مونچھوں کو چومنا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ پلاننگ کے محکمے میں کہیں سے کوئی سہگل صاحب درآمد کئے گئے ہیں۔ سہگل صاحب کو بہت سے غیر ریاستی افسروں کی طرح اپنے بارے میں بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ چند ہفتے قبل وہ دہلی گئے۔ ہوائی اڈے پر سری کنٹھ رینہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ تو انہوں نے بڑے تحکمانہ انداز میں ان سے کہا کہ ٹریڈ کمیشن نے ان کے لئے گاڑی کیوں نہیں بھیجی۔ ہمارے نمائندے کا کہنا ہے کہ رینہ صاحب نے سہگل صاحب کو وہ بے نقطہ سنائیں کہ ان کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ رینہ صاحب نے بلند آواز میں مسٹر سہگل کو یہ اطلاع فراہم کی کہ وہ دہلی میں انہیں گاڑیاں بھیجنے کیلئے تعینات نہیں ہیں۔ اور ان کا عہدہ ٹریڈ کمشنر کا ہے۔ ڈائریکٹر تو واضع کا نہیں...... خدا گواہ ہے کہ سری کنٹھ رینہ سے اس اخلاقی جرأت کی ہم نے کبھی توقع نہ کی تھی۔

....

معلوم ہوا ہے کہ کچھ ماہرین تاریخ نے ریاستی حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ تاریخ کے صفحات سے بخشی غلام محمد کا نام مٹانے کیلئے ان تمام یادگاروں کو مٹانا چاہئے۔ جن سے ان کا نام وابستہ ہے۔ تجربے کے طور پر بخشی سٹیڈیم کو

صفحہ وجود سے مٹانے کے پروگرام پر عمل در آمد شروع ہوا ہے۔ ۱۵/اگست کو آپ کے نمائندے نے جب سٹیڈیم کی حالت دیکھی، تو اسے تجربے کی کامیابی کا یقین ہوگیا۔ گراؤنڈ کا سبزہ سوکھا پڑا ہے۔ سیڑھیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ تار کٹ چکے ہیں، کونوں میں لگے ہوئے لوڈ سپیکر بے کار ہو گئے ہیں اور ایک اطلاع کے مطابق دن بھر یہاں کُتے اور اسی قسم کے بے ضرر جانور ورزش کرتے رہتے ہیں۔ سٹیڈیم میں پندرہ اگست کو یوم آزادی کے موقعہ پر سب سے دلچسپ پروگرام وزیرِاعلیٰ کے سکریٹری مسٹر خالد انصاری نے پیش کیا۔ مسٹر انصاری پولیس کے نوجوانوں کو ان کی بہادری اور جوان مردی کے صلے میں دیئے گئے انعامات کے اعلان نامے پڑھ رہے تھے۔ شہیدوں کی مائیں، بہنیں، بیوائیں اور باپ میڈل لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انصاری صاحب Citaticn پڑھ کر اعلان کرتے کہ مرحوم ...... کا میڈل ان کی بیوہ کو دیا جاتا ہے۔ یہ بڑا رقت انگیز منظر تھا۔ اور سارا سٹیڈیم اُداس نظر آرہا تھا۔ آخری انعام شری بنسی لال اے، ایس، آئی کو دیا جانا تھا۔ انصاری صاحب نے اعلان نامہ پڑھا اور کہا۔ کہ مرحوم بنسی لال کا" ...... اس مرحلے پر اپنے سامنے بنسی لال کو دیکھ کر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ان کے مُنہ سے بدحواسی میں "ارے! وہ تو زندہ ہے" نکل گیا۔ اور سارے سٹیڈیم نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ اس طرح انصاری صاحب کی بدحواسی پوری فضا کو بدلنے میں کامیاب ہوگئی۔ معلوم ہوا ہے کہ انصاری صاحب نے دوست احباب سے یہ کہہ دیا ہے کہ میں نے تو جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔

....

معلوم ہوا ہے کہ ریاستی جن سنگھ نے اپنے دوعدد ممبروں کو اپنی تنظیم سے خارج کردیا ہے۔اخباری استعمال کے لئے ان پر خیانت، بددیانتی اور تنظیمی ہدایات کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔مگر آپ کے نمائندے کا کہنا ہے کہ دراصل ان دونوں ممبروں کے جامہ تلاشی پر ان کے ہاں سے محاذ رائے شماری کے رسید بُک برآمد کئے گئے ہیں ایک اطلاع کے مطابق یہ ممبران اکالی دل میں شامل ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔

○

۵

مرکزی وزارت داخلہ کے ایک اہم ترجمان نے ایک اہم تر انکشاف کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے سرینگر سے لوٹنے کے فوراً بعد وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ سے ڈیڑھ گھنٹے تک بات چیت کی، وزیر اعظم نے وزیر داخلہ کو بتایا کہ مرکزی انٹلی جنس کے افسروں کی تمام تر رپورٹیں غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن ہیں۔ وہ آج تک ہم کو یہی کہتے آئے ہیں کہ کشمیر میں ہمارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ لیکن میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہوں۔ کہ کشمیری عوام کے دلوں میں ہماری کتنی محبت اور عقیدت ہے۔ ترجمان کا کہنا ہے کہ وزیر اعظم نے نندہ جی سے کہا ہے کہ تمام افسروں کو تبدیل کر کے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ وزیر اعظم کی آمد پر سرینگر میں ان کا جو گرم جوشانہ استقبال ہوا، اور سٹیڈیم میں منعقدہ پبلک جلسے میں تقریباً ایک لاکھ کی حاضری دیکھ کر انہیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ مرکزی انٹلی جنس کی اطلاعات بالکل گمراہ کن ہیں۔

....

ایک سرکاری ترجمان نے سرکاری طور پر اس بات کی تردید کی ہے کہ

24 ستمبر کو جموں میں طلباء کے ایک ہجوم نے جو کار جلادی، وہ وزیر صحت تریلو چن دت کی تھی۔ اس تردید پر ایک شیطان قسم کے اخبار نویس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جلی ہوئی کار سے لاتعلقی ظاہر کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اُن نالائق لڑکوں سے لاتعلقی ظاہر کرتے جو اس سارے فتنے کی جڑ ہیں۔ تو بات بنتی۔ جموں سے ''بے پر کی'' کے نمائندے نے اس واقع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جلی ہوئی کار کو اب تک ایک تاریخی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی جموں کانگریس کا مستقبل بھی جل کر راکھ ہو گیا۔

....

شری بلراج پوری نے نئی دہلی کے کیناٹ پیلس میں گھومتے ہوئے ایک، سنسنی خیز انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے بہ صد تحقیق و تفتیش اس بات کا سراغ لگایا ہے کہ صادق سرکار دراصل کیمونسٹ سرکار ہے اور وہ ریاست میں کیمونسٹوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ ابھی تک پُوری صاحب کو یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ کہ صادق سرکار کا تعلق دائیں بازو کی کیمونسٹ پارٹی سے ہے یا بائیں بازو کی؟ لیکن ان کے اکلوتے پیروکار شری وید بھسین نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ سرکار بیک وقت دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے۔ کیمونسٹ پارٹی کو پوری صاحب کے اس انکشاف سے حیرت بھی ہوئی ہے اور مسرت بھی۔ صادق صاحب نے اس انکشاف پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ مقبول عام شعر پڑھا ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر سمجھا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

....

آپ لوگ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن آپ کو میرا مرنا (میری قسم، بطرزِ کشمیری) کہ آپ اس پر یقین کیجئے کہ سرینگر سے ایک انگریزی ہفت روزہ ''اکنا مک پوسٹ'' کے نام سے شائع ہونا شروع ہو گیا ہے اور اس ہفت روزے کا نگران ایک مشہور و معروف وکیل ہے۔ اولین اشاعت میں وہی زبان استعمال کی گئی ہے جو ہمارے ہاں کے ہانجی لوگوں نے ایجاد کی ہے۔ اخبار کی پہلی اشاعت میں ایک دلچسپ اشتہار شائع ہوا ہے۔ جس کا حرف بہ حرف ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

خبریں، خبروں پر تبصرے، فلموں کے متعلق معلومات اور برادرانہ گفتگو (مردانہ و زنانہ) کرنے کیلئے ۳۶۰۹ پر ٹیلی فون کیجئے...... ۲۴ گھنٹوں کی سروس۔''

....

پچھلے دنوں ٹی بی سیلز کمیٹی کی میٹنگ وزیرِ صحت شری ترلوچن دت کی صدارت میں منعقد ہو رہی تھی، ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ ٹکٹ بیچنے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی جائے۔ اس میں کسی سرکاری افسر کو نہ رکھا جائے۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ نہیں کچھ سرکاری افسروں کا اس میں شامل ہونا ضروری ہے۔ اس پر بحث چھڑ گئی۔ ایک نچلے اخبار نویس نے جھلا کر کہا کہ

سرکاری افسروں کے بغیر کام نہ چلے گا۔ ہمارے ہاں کی سیاسی پارٹیاں تک ان کے تعاون کے بغیر نہیں چل سکیں۔ تو یہ کمیٹی ان کے بغیر کیوں کر زندہ رہے گی۔

....

اگر آپ کو اپنی دن بھر کی مصروفیات سے کسی وقت فرصت ملے تو اسمبلی میں ''خدا کی قدرت'' کا مظاہرہ دیکھنے کے لئے تشریف لیجائیے۔ دیکھئے کہ ایوان اسمبلی میں اکثر منابرین (جمع ممبر کی) کس طرح خموشی 'گفتگو ہے، بے زبانی ہے زبان میری' کی تفسیر نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ عمل جراحی کے ذریعے ان کی زبانیں کاٹ کر کسی خیراتی اسپتال میں تقسیم کی گئی ہیں۔

۶

یہ خاکسار ہیچمدان رفتہ رفتہ فلسفہ تناسخ کا قائل ہوتا جارہا ہے اور جن لوگوں کو ریاستی سرکار کے موجودہ سکریٹری جنرل ڈیپارٹمنٹ شیخ غلام احمد عرف عمہ صائب سے واسطہ پڑا ہو وہ بھی یقیناً تناسخ کے قائل ہو گئے ہوں گے۔ سابق چیف سکریٹری کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ انتہائی مغرور، خود پسند اور برخود غلط قسم کے انسان تھے۔ لیکن موجودہ عمہ صائب کی ناہمواری، بدمزاجی، بے مروتی اور نخوت کے افسانے سن سن کر ایسا لگ رہا ہے کہ بیچارے عمہ صائب مفت میں بدنام تھے۔ دور حاضر کے عمہ صائب نے تکبر، تلخ کلامی، فرعونگی اور آمریت کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ اس نمائندے کا خیال ہے کہ اس سابق لیکچرار کے جسم میں عمہ صائب اول کی روح سرایت کرگئی ہے۔ اسی لئے لوگ انہیں عمہ صائب ثانی کہنے لگے ہیں۔

....

صادق صاحب کے عقیدت مندوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی (خود صادق صاحب کو بھی ہونی چاہیئے) کہ ان کے زیر سایہ ایک صالح، صحت منداور

انصاف پسند انتظامیہ تشکیل پا رہا ہے۔ مثلاً ایک منظور نظر ڈاکٹر کو نرسنگ ہوم کی دیکھ بھال کرنے کیلئے صرف دو سو روپے ماہوار الاؤنس دیا جا رہا ہے جبکہ ان کی تعلیمی قابلیت اور پیشہ ورانہ مہارت کے پیش نظر انہیں اس ''خدمت'' کے عوض کم از کم سات سو روپے ملنا چاہئے تھا۔ اسی طرح ایک خاتون ڈاکٹر آج عرصہ چھ ماہ سے ایک ایسے زنانہ اسپتال کی سپرانٹنڈنٹ بنا دی گئی ہیں جو ابھی تک وجود میں نہیں آیا ہے اور جس کے مستقبل قریب میں وجود میں آنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ لیکن سپرانٹنڈنٹ صاحبہ بحیثیت سپرانٹنڈنٹ بڑی باقاعدگی سے تنخواہ حاصل کر رہی ہیں...... ایماندار وزارت زندہ باد۔

....

پچھلے دنوں ''کشمیر کلچرل فورم'' کی کائنات میں ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ اور فرم سے وابستہ سب سے بڑے ٹھیکیدار رحمٰن راہی کے ساتھ وہی کچھ ہوا، جو الجیریا۔ کے سن بیلا کے ساتھ ہوا۔ یعنی ان پر شب خون مارا گیا۔ ''کوشُر مرکز'' سالانہ کانفرنس (جو راہیؔ، کاملؔ اور فراقؔ نے اپنا پیسہ خرچ کر کے منعقد کی تھی) خود رحمٰن راہیؔ کے لئے بڑی منحوس ثابت ہوئی۔ مرکز کے سالانہ انتخابات میں راہیؔ کا سب سے بڑا رقیب یعنی علی محمد لون راہیؔ کو کئی ووٹوں سے شکست دے کر مرکز کا صدر منتخب ہوگیا اور بیچارا کاملؔ بڑی مشکل سے سکریٹری منتخب ہوا۔ اس طرح فرم پر راہیؔ، کاملؔ اور فراقؔ کی اجارہ داری ختم ہو کر رہ گئی۔ اس سانحے میں اس نمائندے کی تمام تر ہمدردیاں راہیؔ صاحب کے ساتھ ہیں۔ خدا انہیں صبر عطا کرے۔

....

ایک اطلاع کے مطابق سرینگر میں پردیش کانگریس کے صدر دفتر کے باہراس طرح بھیڑ لگی رہتی ہے۔ جس طرح شیراز سنیما کے باہر فلم ’’وقت‘‘ دیکھنے والوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ بعض باریک بینوں کا کہنا ہے کہ جس طرح سنیما کے باہر کچھ صیاد قسم کے لوگ ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹ کا دھندہ کرتے ہیں اسی طرح کچھ پہنچے ہوئے کانگریسی کارکن کانگریس ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹ کے لئے فضا ہموار کررہے ہیں، ایک اُمیدوار نے اس نمائندے پر یہ راز افشاء کردیا۔ کہ ایک کانگریسی لیڈر اُسے کانگریس کا ٹکٹ دلانے کے بہانے ابھی تک اس سے پانچ سو روپے کی رقم وصول کرچکا ہے۔ حالانکہ لیڈر موصوف کو خود ٹکٹ ملنے کا قطعی کوئی اندیشہ نہیں ہے، اس نمائندے کو معلوم ہوا ہے کہ ۷۵ نشستوں کیلئے ابھی تک صرف چار سو درخواستیں موصول ہوئی ہیں۔ اکثر لوگ اس طرح درخواستیں دیتے ہیں کہ جیسے لاٹری کا ٹکٹ خرید رہے ہوں۔

....

جموں وکشمیر یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر ہندوستان میں عرب لیگ کے مستقبل نمائندے ڈاکٹر کالوس مقصود نے جو خطبہ پڑھا اس کے متعلق انگریزی کے ایک بہت بڑے پروفیسر نے اس نمائندے کو بتایا کہ ڈاکٹر مقصود کے علاوہ اس خطبے کا ایک لفظ بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پروفیسر موصوف کے خیال میں یہ خطبہ اُس جناتی انگریزی

میں لکھا گیا تھا جو انگلستان میں مائیں بچوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ بے پر کی کے نمائندے کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر کرن سنگھ جو شستہ ٹکسائی انگریزی لکھنے اور بولنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ بھی ڈاکٹر مقصود کی طرف یوں دیکھ رہے تھے۔ کہ جیسے کہہ رہے ہوں۔

مدعا عنقا ہے تیری عالم تقریر کا

ایک اطلاع کے مطابق پچھلے دنوں بخشی کنونشن مین ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اطلاع دہندہ کا کہنا ہے کہ جموں سے آئے ہوئے ڈیلی گیٹوں نے یہ سوال اُٹھایا کہ اگر بخشی صاحب صرف خالد کشمیر ہیں، تو پھر جموں والوں کو ان سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ سوال چونکہ معقول تھا، اس لئے شیام لال صراف نے (جن کی نامعقولیت میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں) اس کا فوراً ایک نامعقول جواب دیا۔ یعنی یہ کہ بخشی صاحب آئندہ سے خالد کشمیر نہیں، بلکہ خالد جموں وکشمیر کہلائیں گے۔ اس کنونشن میں چونکہ لداخ اور پونچھ سے کوئی ڈیلی گیٹ شامل نہیں ہوا تھا۔ اس لئے توقع رکھنا چاہیئے ۔ کہ لداخیوں اور پونچھیوں کے پرزور اصرار پر بخشی صاحب جلد ہی "خالد جموں وکشمیر ولداخ وپونچھ، گلگت ہا، کہلائیں گے۔

....

بگڑا شاعر مرثیہ گو، یا نقاد بن جاتا ہے اور اپنے ہاں ناکام سیاستدان،

ہوم سکریٹری بن جاتا ہے۔ ریاست کے موجودہ ہوم سیکریٹری مسٹر غلام رسول رنیزو کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے ان تمام سیاسی حریفوں سے انتقام لینے میں مصروف ہیں۔ جنہوں نے ان کی سیاسی زندگی میں اِن سے اختلاف کیا تھا یا ان کے خلاف کسی مظاہرے میں حصہ لیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ اپنی حسرتیں پوری کرنے کے لئے وہ بڑی فیاضی سے مقامی پولیس اور سی آئی ڈی کو استعمال کر رہے ہیں۔ برادرانِ عوام کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہماری ریاست کا ہوم سیکریٹری معمولی تھانے دار کو ٹیلی فون کر کے اپنے سابق دشمنوں اور مخالفوں کو ہراسان کرتا رہتا ہے...... صادق وزارت زندہ باد!

....

پچھلے دِنوں ٹیچرس کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے وزیر تعلیم شری ڈی پی اور نے اس بات کا اعتراف کیا کہ انہیں بڑی مدت کے بعد پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔ یارانِ نکتہ دان کا خیال ہے کہ ڈی پی صاحب نے بڑی فنکاری اور چابکدستی سے کابینہ کے وزیروں اور کانگریسی لیڈروں پر گہری چوٹ کی ہے اور انہیں اَن پڑھ اور جاہل قرار دیا ہے۔ کیونکہ پچھلے دو سال سے انہیں انہی لوگوں کی صحبت حاصل رہی ہے۔

....

آپ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ سچ ہے کہ لیمبرٹ لین میں کواپریٹو ایمپوریم کے دروازے پر ایمپوریم کی

طرف سے یہ بورڈ چسپاں ہے۔ جو کوئی ایمپوریم کے بورڈ کے ساتھ چھیڑے گا، وہ اپنی ماں اور بہن کو چھیڑے گا۔ یہ بورڈ اتنی نمایاں جگہ پر ہے کہ ایمپوریم میں جانے والے ہر شخص کی نگاہ اس پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تعجب کی بات ہے کہ یہ بورڈ لکھانے پر سرکاری پیسہ صرف ہوا ہے۔ اس بورڈ سے ایمپوریم کے ملازمین کی خوش مذاقی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

....

معلوم ہوا ہے کہ ریاستی محکمہ اطلاعات کے صدر دفتر سے بعض اہم کاغذات چوری ہوگئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں لنڈن کے ایک اخبار ''ڈیلی ٹیلی گراف'' میں ریاستی محکمہ سیاحت کی تعریف میں ایک مراسلہ شائع ہوا تھا جس کی کٹنگ محکمے کو موصول ہوئی تھی۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کٹنگ کو دن کی روشنی دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اسی طرح محکمے کے ایک ملازم کی ترقی کے کاغذات افسرانِ متعلقہ تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہوگئے۔ مرکزی محکمہ سراغرسانی کے جاسوس اس کھوج میں لگے ہوئے ہیں کہ اطلاعات کے دفتر سے یہ اطلاعات باہر کیونکر جاتی ہیں۔

....

ایک افواہ باز کا کہنا ہے کہ سوپور میں منعقدہ کانگریس کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے محترمہ زینب بیگم نے کانگریسی لیڈروں کو خبردار کیا کہ وہ فوراً اپنے، اعمال کا محاسبہ کریں۔ ورنہ جلد ہی انہیں بھی آئینگر کمیشن کے سامنے

جواب دہ ہونا پڑے گا۔ افواہ باز نے مزید کہا کہ بیگم صاحبہ نے کنونشنوں میں گشتابوں اور مرغن غذاؤں کے استعمال پر بھی کڑی نکتہ چینی کی۔

دروغ برگردنِ راوی

اِدھر بعض قومی کارکنوں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر سیاسی کنونشن میں بھی دال روٹی ہی ملتی رہے۔ تو پھر سامعین ملنا دشوار ہو جائیگا۔ کیونکہ غذا کے معیار کا سامعین کی مقدار پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔

○

۸

عام انتخابات کے لئے کانگریس کا منڈیٹ حاصل کرنے کے جن چار سو افراد نے درخواستیں دی تھیں ان کے ناموں کی فہرست شائع کر دی گئی ہے اس فہرست کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس ٹکٹ کو کچھ لوگ جادوئی قالین سمجھتے ہیں۔ کہ جس پر سوار ہو کر وہ سیدھے اسمبلی میں پہنچ جائیں گے۔ بعض حلقہ ہائے انتخاب سے کچھ ایسے ''نامور'' اشخاص نے بھی درخواستیں دی ہیں جن کو اپنے پڑوسی بھی اچھی طرح نہیں جانتے۔ کچھ پیشہ ور اور عادی مجرموں نے بھی منڈیٹ حاصل کرنے کے لئے تگ و دو شروع کی ہے۔ فہرست میں کچھ سیاسی نابالغوں، سابق محاذیوں اور یودک سبھائیوں کے نام بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ اکثر پرانے پاپیوں نے بھی کانگریس کی چھتر چھایا حاصل کرنے کیلئے فارم بھر دیئے ہیں۔ غرض اُمیدواروں کی ''کثرت'' نے کانگریس کی ''وحدت'' کو ایک خطرناک خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔

....

ہمارے نمائندے نے اطلاع دی ہے کہ ۷۵ نشستوں کیلیئے جن چارسو اُمیدواروں نے کانگریس کا منڈیٹ حاصل کرنے کیلیئے درخواستیں دی ہیں ۔کانگریس منڈیٹ کا اعلان ہوتے ہی ۳۲۵ رامیدوار کانگریس چھوڑ کر مخالف جماعتوں میں شامل ہوجائیں گے۔ایک اُمیدوار نے اس نمائندے کوایک خفیہ انٹرویو کے دوران بتایا کہ اگر کانگریس نے مجھ پر اعتماد کرکے مجھے کانگریس ٹکٹ نہ دیا۔تو سوشلزم ،سیکولرازم اور گاندھی ازم پر میرا وشواس برقرار رہنا محال ہے ایک اور حضرت نے دعویٰ کیا کہ میں نے کانگریس میں شمولیت ہی اس لئے کی ہے کہ مجھے اسمبلی کا ٹکٹ مل جائیگا۔اور اگر یہ نہیں ہوا، تومیں پھر فرقہ پرستی کو اپنا ایمان سمجھنے لگوں گا۔

....

شمیم احمد شمیم شوپیان کے حلقہ انتخاب سے آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑرہے ہیں۔پچھلے دنوں انتخابی مہم کے سلسلے میں منعقدہ ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے شمیم صاحب نے کہا کہ مجھے صادق صاحب اور قاسم صاحب نے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ انتخابات بالکل آزادنہ اور غیر جانبدارانہ فضا میں ہوں گے ۔ دوسرے دن مقامی کانگریسوں کا ایک زبردست ڈیلی گیشن جس کی قیادت وہاں کے ایک عرائض نویس کررہے تھے ۔قاسم صاحب سے ملاقی ہوا۔اوران سے اس پریشان کُن خبر کی تردید کرنے کی استدعا کی۔انہوں نے قاسم صاحب کو بتایا کہ آپ کی اس یقین دہانی سے

شوپیان کے کانگریسی اُمیدوار کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ ہمارے نمائندے کا کہنا ہے کہ قاسم صاحب نے مُسکراتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھ دیا۔

کہا افغان کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا!

....

محاذ رائے شماری کے دو درجن سرکردہ رہنماؤں کے محاذ سے مستعفی ہونے کی خبر کے متعلق محاذ رائے شماری نے بڑی معنی خیز خاموشی اختیار کی ہے۔ محاذ کے عہدے داروں اور لیڈروں نے نہ اس خبر کی تصدیق کی ہے اور نہ تردید۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ یہ خاموشی نیم رضا والی خاموشی ہے یا عوامی ردِ عمل کا اندازہ کرنے کیلئے ''محتاط لاپرواہی'' کا فریب۔ ایک محاذی لیڈر (جس کے بارے میں یہ شبہ ہے کہ وہ مستعفی ہو گیا ہے) نے اس نمائندے کو دھوکہ دیتے ہوئے کہا کہ ''آئینہ'' میں شائع شدہ خبر بالکل غلط تو نہیں ہے لیکن بالکل صحیح بھی نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر لیڈروں نے استعفیٰ دیا بھی ہے اور نہیں بھی۔ یعنی الحاق حتمی بھی ہے اور جزوی بھی، اس کو کہتے ہیں۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!

....

جموں کے طالب علموں نے طلباء پر فائرنگ کی جوڈیشل تحقیقات کرنے والے کمیشن کے سامنے یہ مطالبات پیش کر دیئے ہیں۔

۱۔ ڈویژنل کمشنر، ڈپٹی کمشنر، ڈی آئی جی پولیس اور سپرانٹنڈنٹ پولیس کو

معطل کیا جائے۔

۲/ ایمپوریم کے ملازمین کو ایمپوریم کو جلا ڈالنے کے الزام میں سزا دی جائے۔

۳/ طالب علموں کو امتحان میں شریک ہوئے بغیر ڈبل ترقی دے جائے۔

۴/ جموں شہر کا نظم ونسق طالب علموں کو سونپ دیا جائے۔

۵/ ریاستی سرکار کو برطرف کر کے کسی طالب علم کو جموں و کشمیر کا وزیراعلیٰ مقرر کیا جائے۔

○

۹

ریاستی اسمبلیوں میں ممبروں کی فلور کراسنگ کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کے لیئے مرکزی الیکشن کمیشن نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ عام انتخابات میں ہر کامیاب اُمیدوار کے ماتھے پر اس کا انتخابی نشان کنندہ کیا جائیگا تاکہ جس جماعت کی طرف سے وہ منتخب ہوا ہو۔ اس کی مہر اور چھاپ دنیا کو اس کی اصلیت کی یاد دِلاتے رہے۔ کمیشن کے ایک ترجمان نے کہا کہ ہریانہ، یوپی اور مغربی بنگال میں سیاسی عدم استحکام نے کمیشن کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ غلام داغ کے اس رسم قدیم کو از سر نو تازہ کریں، تاکہ بار بار پارٹی بدلنے والے ممبروں کو اپنی بے شرمی، بے حیائی اور بے غیرتی کا احساس دلایا جا سکے۔

....

نائب وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی نے پچھلے دنوں انڈین انسٹی چیوٹ آف سائیٹفک سٹیڈیز کے اہتمام سے منعقدہ ایک سمینار میں تقریر کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ نشہ بندی کے سوال پر ملک میں استصواب رائے عامہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ محاذ رائے شماری کے بانی

صدر میرزا محمد افضل بیگ نے پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نمائندے کو ایک بیان دیتے ہوئے نائب وزیر اعظم کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا ہے۔ بیگ صاحب نے کہا کہ اگر شری ڈیسائی نشہ بندی کے سوال پر استصواب رائے کرانے پر تیار ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ کشمیر میں استصواب رائے کے خلاف نہیں ہوسکتے۔ نمائندے کا کہنا ہے کہ محاذ رائے شماری کا ایک وفد عنقریب دہلی جا کر شری مرار جی ڈیسائی کو محاذ کی بنیادی ممبر بننے کی درخواست کریگا۔

....

ڈی آئی جی کشمیر شری ڈی این کول جو ان دنوں رخصت پر ہیں۔ حادثات کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کر رہے ہیں۔ شری کول نے ہمارے نمائندے کو ایک بیان دیتے ہوئے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ وہ یہ کتاب پروین اختر نامی لڑکی سے مسنون کر رہے ہیں۔ تا کہ سند رہے۔ شری کول کا کہنا ہے کہ کشمیر میں سیکولر ہو کر دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دینا انتہائی حماقت ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے آدمی دونوں طرف سے مار کھاتا ہے "حادثات" کا پہلا باب اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

زاہد تنگ نظر نے کافر مجھے جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

....

ریاستی حکومت کے ایک ترجمان نے اس خبر کی پُرزور تردید کی ہے کہ حکومت کچھ سرکاری اخبار جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ترجمان نے ایک

غیر ملکی خبر رساں ایجنسی کے نمائندہ خصوصی کو رازدارانہ لہجے میں بتایا کہ ریاستی حکومت نکمی ضرور ہے لیکن بیوقوف نہیں ہے۔ اس بیان کی تشریح کرتے ہوئے ترجمان نے کہا کہ حکومت بہت سے وفادار اخبارات کی خدمت کا محنتانہ ادا کر رہی ہے اور جب تک وفادار اخبارات موجود ہیں۔ سرکاری اخبارات جاری کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ سرکاری ترجمان نے دعویٰ کیا کہ اگر ان اخبارات کے نام شائع کردیئے جائیں جنہیں خزانہ غیب سے نوازا جارہا ہے تو دنیا دم بخود رہ جائے گی۔

....

ریاست کے سب سے بڑے ماہر انتخابات شری غلام حسن نحوی سرینگر سے ''چنار'' نام کا ایک روزنامہ شائع کر رہے ہیں شری نحوی نے ہمارے نمائندے سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ''چنار'' پیر غیاث الدین اور ان کا مشترکہ اخبار ہوگا۔ اور وہ اسے ایڈٹ کریں گے۔ انہوں نے ہمارے نمائندے کو ترغیب دی کہ وہ ''آئینہ'' چھوڑ کر چنار میں شامل ہو جائیں (ہمارے نمائندے نے کیا جواب دیا اس کی تحقیقات ہو رہی ہے) شری نحوی نے ''چنار'' کی ایڈیٹوریل پالیسی کے متعلق کچھ بتانے سے انکار کردیا۔ لیکن اس بات کا انکشاف کیا کہ وہ ''ووٹ کیسے چُرائے جاتے ہیں'' کے عنوان اسے ایک مستقل کالم شروع کریں گے۔ ادھر قیصر قلندر نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۴۴ء میں شری نحوی نے کالج سرینگر میگزین میں کنہیا لعل کپور کا ایک مضمون اپنے نام سے چھاپ کر اپنے ادیب ہونے کا

اعلان کیا تھا۔

....

وزیر خزانہ و وزیر زراعت شری ڈی پی در کی پُر اسرار گمشدگی کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اُڑ رہی ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے سنیاس لیا ہے۔ کسی نے انہیں سانچی کے مقام پر ایک مہارشی کے پیر دباتے ہوئے دیکھا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر فلم لائن اختیار کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں اور فلمی ہستیوں سے راہ و رسم بڑھا رہے ہیں ایک افواہ باز کا کہنا ہے کہ دراصل در صاحب اپنے علاج کے سلسلے میں دربدر ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق صادق صاحب نے در صاحب کو لکھا ہے کہ جلد چلے آؤ۔ میر قاسم کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

....

مشہور قوم پرست مسلمان پنڈت پریم ناتھ بزاز کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ عنقریب شائع کر رہے ہیں۔ ایک بزازی اخبار نویس نے بزاز صاحب سے اس مقالے کو بالاقساط شائع کرنے کا کاپی رائٹ حاصل کر لیا ہے اور توقع ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد کشمیری پنڈت اپنی ملتوی شدہ ایجی ٹیشن دوبارہ شروع کریں گے۔ تحقیقی مقالہ انگریزی میں ہوگا اور اس کی قیمت ایک روپیہ فی کاپی ہوگی۔

O

جموں میں ایک خفیہ تنظیم کی طرف سے ہر روز شہر میں ایک سائیکلو سٹائلڈ ٹیلی گرام ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا جاتا ہے، جس میں کشمیری پنڈتوں پر کشمیری مسلمانوں اور کشمیر پولیس کی طرف سے توڑے گئے مظالم کی ہوشربا داستانیں رقم ہوتی ہیں۔ جموں سے ''آئینہ'' کے ایک مہربان شری وید بھسین نے ہمیں ایک ایسے ہی تار کی نقل بھیجی ہے۔ جسے ہم من وعن شائع کر رہے ہیں۔ تاکہ سرینگر میں کشمیری پنڈت بھائیوں کو بھی اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی اطلاع مل سکا۔

''پچھلے دو چار دنوں میں تقریباً دو سو کشمیری پنڈت قتل کر دیئے گئے ہیں۔ حکومت نے صرف ہندو علاقوں میں کرفیو لگا دیا ہے اور مسلمان کشمیر پولیس کی مدد سے ہندوؤں کی دُکانیں لوٹ رہے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو ہندو لڑکیوں کو اغوا کیا جا چکا ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری۔ ہے۔ مندروں میں مورتیاں توڑ دی گئی ہیں اور کئی مندر جلا دیئے گئے ہیں۔ کشمیری پنڈت اپنے ڈوگرہ بھائیوں کے بہت مشکور ہیں......''

......اور لطف کی بات یہ ہے کہ جموں میں سرینگر سے آنے والے ان تار ہائے برقیہ کی تقسیم اور تشہیر کا کام کھلے بندوں ہو رہا ہے!

....

حکومت ہند کی وزارت ''دین و دنیا'' نے کچھ عرصہ قبل سیکولرازم کی ایک نئی اور جامع تعریف وضع کرنے کے لئے جو کمیٹی قائم کی تھی۔ اس نے مرکزی حکومت کو اپنی سفارشات پیش کر دی ہیں۔ ہمارے نمائندے کا کہنا ہے کہ کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ نئے حالات کے پیش نظر سیکولرازم کو زیادہ وسیع اور فصیح بنانے کیلئے ہندو سیکولرازم، مسلم سیکولرازم، کمیونسٹ سیکولرازم، کشمیری پنڈت سیکولرازم مجلسِ مشاورت سیکولرازم اور جن سنگھ سیکولرازم کی اصطلاحیں بھی استعمال کی جانی چاہئیں۔ تاکہ ہندوستان پر ریسرچ کرنے والے مغربی سکالرس کو ہندوستانی سیکولرازم کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ حکومت ہند نے کمیٹی کی سفارشات کو شائع کئے بغیر منظور کر دیا ہے۔

....

کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن کے دوران جن کمیونسٹ دوستوں نے مارکس اور لینن کو ماں بہن کی گالی دے کر پریم ناتھ گھاسی اور بدری ناتھ مٹو کو اپنا رہبر تسلیم کر لیا تھا۔ انہوں نے رفتہ رفتہ پھر اپنے کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ کل ایک ایسے ہی ہندو کمیونسٹ پروفیسر نے پنڈت ایجی ٹیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایجی ٹیشن دراصل بورژوا ذہنیت کے پرولتاری مظاہرے کا ابتدائی مرحلہ تھا اور اس سے طبقاتی جنگ میں سامراجی

عزائم کو جدلیاتی مادیت کے اصل پسِ منظر میں شکست دی جاسکتی ہے۔

....

ریاستی حکومت نے کشمیر کے چھ اخبارات کی اشاعت پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر کے ریاست کو فرقہ پرستی کے خطرے سے محفوظ کر لیا ہے۔ وزارت داخلہ کے ایک ترجمان نے ہمارے نمائندے کو بتایا ہے کہ کشمیر میں پچھلے دو ماہ سے فرقہ پرستی کی جو وبا پھیل گئی تھی۔ وہ انہی اخبارات نے پھیلائی تھی۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ترجمان نے کہا کہ جموں کے سبھی اخبارات مکمل طور پر سیکولر ہیں۔ اس لئے وہاں کسی اخبار کی اشاعت پر پابندی عائد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترجمان نے مسکراتے ہوئے کہا کہ دراصل ہم ''مارتنڈ'' اور ''نوائے کشمیر'' کو بند کر دینا چاہتے تھے۔ ترجمان، جیوتی، رہنما اور روشنی تو شعر کا وزن پورا کرنے کیلئے استعمال ہوئے ہیں۔

....

۴ر اکتوبر کو شہر میں دکانیں لوٹنے کی واردات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک کشمیری قوم پرست نے بڑی دلچسپ بات کہی۔ موصوف نے کہا کہ کشمیری میں سیکولرازم اور بھائی چارے کی روایات اتنی گہری اور مضبوط ہیں کہ لوٹ مار اور آتش زنی میں بھی سیکولرازم کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہندو اور مسلمان دونوں کی دکانیں لوٹی گئی ہیں اور تعداد بھی قریباً برابر برابر ہے۔ اسی طرح کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن میں جو دو مکانات جلے۔ ان میں

ایک ہندو کا مکان اور دوسرا مسلمان کا۔ یہ بات جموں میں نہیں پائی جاتی۔ وہاں برق جب بھی گرتی ہے......تو بچارے مسلمانوں پر...... یہ بات سُن کر ہمارے نمائندے نے ''کشمیری صوبہ'' زندہ باد کا نعرہ دیا!

....

شمیم احمد شمیم پچھلے دنوں کابل گئے ہوئے تھے۔ کابل میں گدھے کو بار برداری کے علاوہ سواری کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک بظاہر معزز آدمی کو گدھے پر دیکھ کر شمیم صاحب نے اپنے ایک افغان دوست سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہ حیرت ہے کہ اتنا معزز آدمی گدھے پر سوار ہے۔

کیا آپ کے ہاں گدھے پر سوار نہیں ہوتے؟'' افغان دوست نے پوچھا۔

جی نہیں، ہمارے ہاں گدھے انسان پر سوار ہیں۔'' ......شمیم صاحب نے کہا۔

اور افغان دوست حیرت سے شمیم صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔

مشغلے

ریڈیو کشمیر

تیسرے درجے کے پروگرام نشر کرنا، ہر صبح ضروریات زندگی کے فرضی داموں کی فہرست سنانا، دس بار نشر شدہ پروگراموں کو بار بار نشر کرنا۔اور اس کے جواز میں سستے داموں کے فرضی خطوط براڈ کاسٹ کرنا۔غلط خبریں نشر کرنا، اصل خبروں کو پھیلنے سے روکنے کی کوشش کرنا۔ بھارتی آواز اور خوفناک تلفظ والے اناؤنسروں سے سامعین کے ذوقِ سماعت کو مجروح کرنا۔دوستی اور تعلقات کو نبھانے کے لئے گھٹیا درجے کے مقرروں سے گھٹیا تقریریں نشر کرانا۔اہل اقتدار کی خوشنودی کے لئے بار بار ان سے اور ان کے عزیز واقرباء سے پروگرام لکھوانا۔موہن لال ایمہ کے تیار کردہ کشمیری '' گانوں کی دھنیں بار بار استعمال کرنا۔ ٹیگور ہال میں تیسرے درجے کے موسیقی کے پروگرام پیش کرنا۔دن بھر عمدہ فلمی گیت سنانا۔موسم کے متعلق غلط پیشین گوئیاں کرنا۔وادی کی آواز نشر کر کے لوگوں کو اپنے ریڈیو سٹ بیچنے

پر مجبور کرنا۔

انجینئرنگ کالج

بہت ہی خوبصورت جگہ پر واقع ہونا۔ سفارشی انجینئر تیار کرنا۔ طالب علموں کی قابلیت کی بجائے سفارش کرنے والوں کی عظمت کا احترام کرنا۔ کبھی کبھی امتحان لینا۔ امتحان کو بار بار ملتوی کرنا۔ فیل ہونے والوں کو سرکاری احکامات کے مطابق پاس کرنا۔ انجینئرنگ سے زیادہ طالب علموں کو فن موسیقی و مصوری میں تربیت دینا۔ جغرافیہ پڑھے ہوئے پروفیسر کو کالج کا پرنسپل بنانا اور فزیکس میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے والے سے انگریزی پڑھانا۔ غرض اُلٹی گنگا بہانا۔ ریٹائرشدہ افسروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دریافت کرنا۔ اور انہیں اہم عہدوں پر تعینات کرنا۔ نوجوانوں کی راہ میں طرح طرح کی اڑچنیں پیدا کرنا۔ ہلڑبازی طالب علموں کو سیاسی مصلحتوں کی بناء پر سزادینے کی بجائے چھوڑ دینا۔

صدر اسپتال سرینگر

خدا کے بندوں سے زندگی چھیننا اور مریضوں کی رہی سہی تندرستی چرانا، اثر ورسوخ والے لوگوں کا علاج معالجہ کرنا، غریبوں، بے کسوں کو فٹ بال کی طرح کھیلنا، ڈاکٹر صاحبان کا نرسوں اور لیڈی ڈاکٹروں سے بیکوقت

معاشقے لڑانا۔ خدمتگاروں کی مریضوں کی، جیبیں ٹٹولتے رہنا۔ انڈور مریضوں میں مقررہ کھانے کا نصف تقسیم کرنا۔ باقی نصف کا پُراسرار طور غائب ہوجانا، بڑے ڈاکٹر صاحبان کا آپس میں لڑتے رہنا، چھوٹے ڈاکٹر غریب اور کمزور مریضوں پر غصہ کرنا۔ ہر ضروری دوا کا ''اوٹ آف اسٹاک ہونا'' دوائی میں پانی کا بافراط استعمال ہونا۔ مشین ایکسرے سال میں آٹھ مہینے اوٹ آڈر ہی ہونا۔ اسپتال کی ادویات کا بازار میں سستے داموں بیچنا اور اونچی دکان ہونا پھیکا پکوان بیچنا...... ضروری ساز وسامان کا مفقود ہونا، غیر ضروری عملے میں روزافزوں اضافہ ہونا، یعنی شفاخانے کی بجائے جفاخانہ ہونا۔

پولیس اسٹیشن خانیار

بے گناہوں کو پکڑ کر بند کرنا۔ پھر ان کے رشتے داروں سے پیسے وصول کرنا، اصلی مجرموں کی پشت پناہی کرنا، پُرامن شہریوں کے لئے وبال جان بن جانا، جواریوں کو پکڑ کر ان سے ''نذرانہ'' وصول کرنا۔ اور پھر شام کو یہ ''مال غنیمت'' آپس میں تقسیم کرنا۔ علاقے بھر کے بدمعاشوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اور شریف لوگوں کی عزت وآبرو کے لئے خطرہ ہونا، نا اہل، بددیانت اور رشوت خور پولیس افسروں کی حوصلہ افزائی کرنا۔ نظم ونسق کی ابتری پولیس کی دھاندلیوں کی زندہ جاوید مثال ہونا، یعنی قانون کے نام

پرلا قانونی کی یادگار ہونا کار ہونا۔

محکمہ موسمیات

موسم کے متعلق غلط پیشین گوئیاں کرنا۔ جب بارش ہو رہی ہو،تو دھوپ کا اعلان کرنا، اور جب سخت تپش ہو۔تو بارش گرج اور طوفان کی تشہیر کرنا۔ وزیر خوراک پیر غیاث الدین کی طرح رات دن باالفاظ دیگر مستقل جھوٹ بولتے رہنا۔ کشمیر کی سیاست کی طرح بے اعتبار ہونا، حکومت کی طرح کسی قانون اور ضابطے کا پابند نہ ہونا۔ آسمان کو دیکھ کر موسم کا اندازہ کرنا، بار بار دھوکھا کھانا، ہزار بار دھوکہ دینا۔

وکیل صاحب کے قلم سے

مشورے

دینا ناتھ نادم

کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر شاعری کی وادی میں لوٹ آئیں ۔ اس دیار میں ان کی عدم حاضری کا فائدہ اُٹھا کر بہت سے مٹی کے شیروں کو اپنے اصلی شیر ہونے کا گمان ہونے لگا ہے۔ نادؔم کے اکثر خوشہ چین نادم کی گوشہ نشینی کو ان کا اعتراف شکست سمجھ کر اب ان پر حملہ آور ہو رہے ہیں ۔ ان پر لازم ہے کہ وہ سرکاری ملازمت کی زنجیروں کو توڑ کر ایک بار پھر کشمیری شاعری کو ایک نیا بانکپن اور نیا انداز عطا کریں۔

رحمان راہی

کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ اپنی رفتار ذرا مدھم کریں ۔ وہ جس رفتار سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں ۔ اس سے وہ بلندیوں کو تو چھولیں گے، لیکن زمین سے ان کا رشتہ کٹ جائے گا۔ ہمیں ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہے۔ لیکن ان کی بڑھتی ہوئی داخلیت پر اعتراض ہے۔ ان پر لازم ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے بارے میں اُڑنے والی افواہوں کی تردید کرتے رہیں۔

کشمیر چھوٹی سی جگہ ہے، معلوم نہیں کب کوئی افسانہ نگار انہیں اپنی کہانی کا موضوع بنا ڈالے۔

محمد امین کامل

کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ کشمیری افسانے میں گل بوٹے کھلاتا رہے کیونکہ اس کے بارے میں ابھی تک نہ فیصلہ نہیں ہو پایا ہے کہ وہ زیادہ اچھا شاعر ہے یا افسانہ نگار۔ اس کے بارے میں عام اطلاع یہ ہے کہ وہ اکثر ''فل تانگے'' پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے افسانوں اور غزلوں کے لئے خام مواد مہیا کرنے کے لئے عملی تجربات حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہ بڑا ہی خطرناک رجحان ہے اور کامل کو اس سے فوراً باز آجانا چاہیے۔

اختر محی الدین

کو مشورہ دیا جاتا ہے۔ کہ وہ جب تک کوئی نیا ہنگامہ خیز افسانہ نہ لکھیں۔ ان کی ادبی زندگی خطرے سے پڑی رہے گی۔ ان کے خلاف ایک زبردست سازش منظّم ہوئی ہے۔ جس کی رُو سے چند ماہ بعد ان کا نام لینا بھی جرم قرار دیا جائیگا۔ ان پر یہ الزام عائد ہوا ہے کہ ڈھائی افسانے لکھ کر وہ زندگی بھر کیلئے کشمیری افسانہ نگاروں کے سر پر سوار رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ جلدی جلدی دو ایک نئے افسانے لکھ کر ایک بار پھر اپنے وجود کا اعلان کریں۔

ادبی دنیا میں مکان بنانے سے نہیں اپنا مقام پیدا کرنے سے ادیب زندہ رہتا ہے۔ مزید اطلاع کے طور پر عرض ہے کہ فیلڈ سروے کا ہفت روزہ ''چمن'' ان کے علاوہ کوئی اور نہیں پڑھتا۔

شری موہن یاور

کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً اپنے نئے افسانوی مجموعے کی اشاعت کا اعلان کر دیں۔ ورنہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ یاور اب افسانہ نگار نہیں بلکہ صحافی ہو کر رہ گیا ہے اور ایک ادیب کو اس سے بڑھ کر کیا گالی دی جاسکتی ہے کہ وہ صحافی ہو گیا ہے۔ اُس کے متعلق یہ افواہ بھی اُڑی ہوئی ہے کہ وہ اپنی بیوی سے عشق کرنے لگا ہے۔ اپنی بیوی سے عشق عام طور پر افسانہ نگار کی موت کا آغاز ہوتا ہے۔ انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً اس الزام کی عملی تردید کریں۔

حبیب اللہ حامدی

جو جلد ہی ڈاکٹر بننے والے ہیں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تمام اُردو شاعری کا ترجمہ کشمیری زبان میں کر لیں۔ ایک مشاعرے میں ان کی ایک کشمیری غزل سن کر یہ اندازہ ہوا کہ اگر انہوں نے شروع سے ہی کشمیری شاعری کی طرف توجہ کی ہوتی۔ تو آج ان کا شمار کشمیری شاعروں کے صفِ اوّل میں ہوتا۔ بہر کیف دیر آید، درست آید، وہ اب بھی اس کی تلافی کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر حیدری

کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنا شہرۂ آفاق ناول ''فطرت'' ساہتیہ اکاڈمی کے اس سال کے انعامات کے لئے پیش کردیں۔ حیدری صاحب نے اس ناول میں جس طور پر کشمیر اور لکھنو کو ملا دیا ہے۔ وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔ اس سے ہند کشمیر الحاق کو جو تقویت ملی ہے۔ اس کے پیش نظر حیدری صاحب کا نام پدم بھوشن کے لئے بھی تجویز کیا جانا چاہیے۔

جو لوگ

مشاعروں میں ہوٹنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ فرصت کے اوقات میں وکیل صاحب سے ضرور مشورہ کرلیں۔ اس مشورے کے لئے کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔ لیکن ہوٹنگ کے آداب سے ضروری واقفیت بہم پہنچائی جائیگی۔

وکیل صاحب کے قلم سے

ریاستی حکومت نے ۴۰۴ سرکاری ملازمین کو گذشتہ سال پاکستانی حملے کے دوران اپنے فرائض کی ادائیگی اور غیر معمولی محنت کے صلے میں نقدی انعامات سے سرفراز کیا ہے۔ خاکسار کو اس فہرست کے مطالعے کے بعد یہ احساس ہوا کہ بہت سے حق داروں کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ اس لئے خاکسار مشورہ دیتا ہے کہ اس فہرست کو مکمل، مفصل اور جامع بنانے کیلئے مندرجہ ذیل کو بھی خصوصی انعامات دیئے جائیں:۔

....

ریاستی کابینہ کے سبھی وزیروں کو ۵ ہزار روپے فی کس بطور انعام دیا جائے کہ وہ حملہ آوروں کے بتہ مالنہ تک پہنچنے کے باوجود سرینگر میں موجود رہے اور بہ حفاظت اپنے مکانوں کے تہہ خانوں سے ٹیلی فون پر ایک دوسرے کی خبر و خیریت پوچھتے رہے۔

....

چیف سکریٹری شری منگت رائے اور ڈویژنل کمشنر شری انور کریم کو

تین تین ہزار روپے کے انعامات دئے جائیں کہ وہ پاکستانی حملے کے دوران استعفیٰ دے کر بھاگ نہیں گئے۔

....

صدر اسپتال کے سبھی ڈاکٹروں کو بیکوقت تین سالانہ ترقیاں دی جائیں کہ پاکستانی تخریب کاروں کی شرانگیزیوں کے باوجود یہ جوان مرد اسپتال میں مریضوں کا علاج کرتے رہے۔

....

غنی حجام کو ڈیڑھ ہزار روپے کا نقد انعام دیا جائے کہ جب بتہ مالو جل رہا تھا تو وہ بڑے اطمینان کے ساتھ گاہکوں کی حجامت بنا رہا تھا۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کی اس سے بڑھ کر قابل تقلید مثال کیا ہو سکتی ہے؟

....

سلطان دھوبی کو فوراً سرکاری ملازمت دی جائے کہ سرینگر پر ہوائی حملے کے دوران بھی وہ گھاٹ پر معززین شہر کے کپڑے دھوتا رہا۔ اور اس نے پاکستانی جہازوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا!

....

شہر کے بِھک منگوں کو ''تمغہ شجاعت'' عطا کیا جائے کہ حملہ آوروں کی پیش قدمی کے باوجود وہ بھیک مانگنے سے باز نہیں آئے بلکہ جوں جوں حملہ آوروں کی تخریبی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں، ان کے بھیک مانگنے کی صلاحتیں بھی اُبھرتی رہیں۔

....

شہر کے جیب کتروں کو مُرادآبادی قینچیاں عطا کی جائیں کہ پاکستانی حملے کے دوران بھی وہ جیب کُترنے کے شغل سے باز نہیں آئے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کی اس سے بڑھ کر کون سی مثال ہو سکتی ہے؟

....

شہر بھر کے چوروں کو ایک ایک ہزار روپے کا الاؤنس دیا جائے کہ پاکستانی حملے کے دوران ان لوگوں کے لئے رات کو اپنے گھروں سے نکل کر دوسروں کے گھروں میں جانا ممکن نہ ہو سکا۔ جو چور کرفیو کے باوجود دُکانوں میں نقب لگاتے رہے انہیں ''تمغہ شجاعت'' عطا کیا جائے!

....

محاذ رائے شماری، پولیٹکل کانفرنس اور عوامی ایکشن کمیٹی کو ایک لاکھ روپے کی سالانہ گرانٹ دی جائے کہ پاکستانی حملے کے دوران ان جماعتوں نے ایک بھی مظاہرہ، جلسہ یا ریزولیوشن پاس نہیں کیا۔ اور صرف ''صدائے کشمیر'' ریڈیو کی نشریات سننے پر ہی اکتفا کیا۔

....

''اصلی مجرم'' کو ایک عدد سیکوٹر انعام میں دیا جائے کہ اس نے حملے کے دوران کسی زیارت سے کوئی متبرک نشانی چرانے کا ارتکاب نہیں کیا اور اس طرح اندرونی امن و امان کو برقرار رکھنے میں سرکار کی مدد کی۔

....

افواہ بازوں کو ایک ایک ٹرانسسٹر انعام کے طور پر عطا کیا جائے کہ انہوں نے سخت نامساعد حالات میں بھی اپنی نیوز سروس کو جاری رکھا اور طرح طرح کی افواہوں سے شہریوں کا دِل بہلاتے اور دہلاتے رہے۔

ان تمام افسروں کو ''امتیازِ جرأت'' عطا کیا جائے جو تخریب کاروں کا نام سنتے ہی اُن ''خطرناک'' علاقوں سے بھاگ آئے جہاں وہ تعینات تھے۔ جان کی سلامتی اور ملک کی حفاظت چونکہ لازم وملزوم ہیں اس لئے وہ دراصل ملک کی سلامتی کی خاطر محفوظ مقامات کی طرف بھاگ آئے تھے۔

....

محکمہ اطلاعات کے جواہر لال مام گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے کہ یہ بیوقوف، ایمرجنسی کے دوران صبح سے شام تک کام کرتا رہا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے وہ فہرست ٹائپ کی جس میں اُن افسروں کو اعلیٰ خدمات کے لئے انعامات دئے گئے ہیں۔ جنہوں نے ہنگامی حالات میں صرف اپنی تنخواہ کے بِلوں پر دستخط کئے تھے؟

نوک جھونک

عجائب گھر

پیر مبارک شاہ قادری تقریر کر رہے تھے۔ ایوان ہی نہیں، پریس گیلری بھی زعفران زار بنی ہوئی تھی۔ پیر صاحب کا انداز، ان کا لب ولہجہ، ان کی زباندانی اور پھر ان کی آواز، یہ سب مل کر قیامت ڈھا رہے تھے۔

''یہ حضرت یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' ایک اخبار نویس دوست نے شمیم احمد شمیم سے پوچھا۔

اوران کے لئے جگہ ہی کہاں تھی؟ شمیم صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''مطلب؟'' اخبار نویس دوست نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''بھائی! یہ اسمبلی کا ہال پہلے عجائب گھر تھا۔ اس کا صرف نام ہی بدل دیا گیا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو، یہاں کتنے عجوبے جمع ہیں'' شمیم احمد شمیم نے وضاحت کی اور اخبار نویس دوست اچھی طرح مطمئن ہو گئے۔

چور ہی چور

وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق کے محکمہ جات سے متعلق مطالبات زر پر بحث شروع ہونے سے پہلے نیشنل کانفرنس کے پیر محمد یحییٰ صدیقی اور شمیم احمد شمیم نے مطالبہ کیا کہ ان پر بحث کیلئے تین گھنٹے ناکافی ہیں، صادق صاحب نے پیشکش کی کہ وہ اپوزیشن کو زیادہ وقت دینے کے لئے تیار ہیں۔ بالآخر یہ طے ہو گیا کہ ان مطالباتِ زر پر بحث کے لئے دو نشستیں ہوں۔ اور اس طرح شمیم احمد شمیم کو پانچ منٹ کی بجائے بارہ منٹ ملے۔

''میرا خیال ہے کہ شمیم صاحب اب مطمئن ہو گئے ہوں گے'' صادق صاحب نے باآواز بلند پوچھا۔

''ژہ ہز لگ ہوی بلا یہ مگر یم چھی نا دچھن کھور ژ وری ژور'' (آپ کے تو ہم قربان جاتے مگر آپ کے دائیں بائیں چور ہی چور بیٹھے ہوئے ہیں) شمیم احمد شمیم نے بے ساختہ جواب دیا۔ اور خود صادق صاحب بھی بے اختیار ہنسنے لگے۔

اتفاق کی بات کہ اس وقت ان کے دائیں طرف ڈی پی در بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈی پی صاحب خفیف ہو کر اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئے۔ اور شمیم صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ آیئے آپ میری جگہ پر بیٹھ جایئے۔'' ''جی نہیں، آپ نے اس کرسی کو اس قابل ہی کہاں رکھا ہے کہ اس پر کوئی شریف آدمی بیٹھ سکے۔'' شمیم صاحب نے جواب دیا۔

گولی مار دو

جن سنگھ کے شیو چرن گپتا بجٹ پر تقریر کر رہے تھے۔ کہ انہوں نے سرینگر سے شائع ہونے والے روزنامہ 'چنار' کی نمائش شروع کر دی۔ انہوں نے شکایت کی یہ اخبار صرف دو ڈھائی ماہ سے نکل رہا ہے لیکن ایک منسٹر صاحب کی وجہ سے اسے دھڑا دھڑ اشتہارات ملنے شروع ہو گئے ہیں۔

ممبروں کو ایک اخبار دکھاتے ہوئے گپتا صاحب نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا کہ اس اخبار میں شیخ محمد عبداللہ کے بیانات بھی چھپتے ہیں۔

''تو پھر اس کے پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کو گولی مار دینا چاہئے'' شمیم صاحب نے تجویز پیش کی۔

''شکر ہے آپ نے ہماری ایک بات سے تو اتفاق کیا'' شیو چرن گپتا نے سنجیدگی سے شمیم صاحب کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔

خاندانی طبلچی

''اس بات کیلئے آپ بھی واویلا کیجئے، ہم بھی واویلا کریں گے، شری ڈی پی در سولات کے گھنٹے کے دوران ایک ممبر کی تشفی کر رہے تھے۔

''آپ کیوں واویلا کرنے لگے۔ آپ ہی کی بدولت تو یہ سب کچھ تو ہوا ہے۔ واویلا ہم کریں گے''، شمیم احمد شمیم نے مداخلت کی

''جی ہاں! آپ واویلا کیجئے۔ میں طبلے پر سنگت کروں گا۔ ڈی پی صاحب نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہاں کیوں نہیں، وہ تو آپ کا آبائی پیشہ ہے''

شمیم صاحب نے انکشاف کیا۔

خاموشی کی داد

نیشنل کانفرنس کے پیر محمد یحیٰ صدیقی عام طور پر آپے سے باہر نہیں ہوتے۔لیکن جب وزیر ٹرانسپورٹ کنور رنجیت سنگھ جموال نے ایک سوال کے متضاد جوابات دئے۔تو پیر صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ بدقسمتی سے کانگریس کے ایس کے کول نے منسٹر کی وکالت میں کچھ کہہ دیا۔بس پھر کیا تھا۔صدیقی صاحب کی قیادت میں نیشنل کانفرنس کا سارا گروپ ان پر ٹوٹ پڑا۔ چیخ وپکار کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ سپیکر صاحب بھی بے بسی کے عالم میں یہ تماشا دیکھتے رہے کچھ دیر بعد شمیم احمد شمیم اپنی نشست پر کھڑے ہوئے۔

''جناب والا'' انہوں نے بآواز بلند کہا۔ ایوان پر خاموشی طاری ہوگئی۔اور سب ممبران ان کی طرف متوجہ ہوئے۔''مجھے اس بات کے لئے داد دیجئے۔کہ ایسا موقع ملنے کے باوجود میں خاموش رہا۔شمیم صاحب کے اس فقرے نے سارا ماحول بدل دیا اور صدیقی صاحب بھی ہنسنے لگے۔

پرانے خیالات

ڈپٹی وزیر تعلیم شری نور محمد تعلیم سے متعلق مطالبات زر پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔ان کی تقریر جب طویل سے طویل ہونے لگی۔تو شمیم احمد شمیم نے ڈپٹی سپیکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ ڈپٹی منسٹر صاحب سے یہ پوچھ لیجئے کہ وہ کتنے دنوں بولتے رہیں گے۔

''اب تھوڑی رہ گئی ہے۔'' نور محمد نے جواب دیا۔ اور پھر خود ہی کہنے لگے ''معاف کیجئے، مذاق بہت پرانا ہے۔''

''مطمئن رہیے، آپ کے خیالات بھی اتنے ہی پرانے ہیں'' شمیم صاحب نے جواب دیا۔

ناقابلِ معافی

''میں اس کیلئے معافی چاہتا ہوں'' ڈی پی در سوالات کے گھنٹے کے دوران اپنی کسی حماقت کیلئے ایک ممبر سے معافی مانگ رہے تھے۔

ممبر صاحب نے پھر اعتراض کیا، تو سپیکر صاحب نے کہا کہ اب جب منسٹر صاحب معافی مانگ رہے ہیں تو اس بات کو چھوڑ دیجئے۔

''جناب یہ آدمی پچاس بار معافی مانگ چکا ہے، اس کا کیا بھروسہ''، شمیم احمد شمیم بولے۔

''مگر آپ نے ایک بار بھی معاف نہیں کیا ہے'' ڈی پی صاحب نے فریاد کی۔

نمائندگی

وزیر صحت محمد ایوب خان اپنے محکمہ جات سے متعلق مطالبات زر پر بحث کا جواب دیتے ہوئے فیملی پلاننگ کی اہمیت پر زور دے رہے تھے کہ ایک ممبر نے تجویز پیش کی، کہ فیملی پلاننگ کا آغاز اس ایوان سے ہونا چاہیے:۔

چور ہی چور

وزیراعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق کے محکمہ جات سے متعلق مطالبات زرِ پر بحث شروع ہونے سے پہلے نیشنل کانفرنس کے پیر محمد یحییٰ صدیقی اور شمیم احمد شمیم نے مطالبہ کیا کہ ان پر بحث کیلئے تین گھنٹے ناکافی ہیں، صادق صاحب نے پیشکش کی کہ وہ اپوزیشن کو زیادہ وقت دینے کے لئے تیار ہیں۔ بالآخر یہ طے ہوگیا کہ ان مطالباتِ زرِ پر بحث کے لئے دو نشستیں ہوں۔ اور اس طرح شمیم احمد شمیم کو پانچ منٹ کی بجائے بارہ منٹ ملے۔

''میرا خیال ہے کہ شمیم صاحب اب مطمئن ہوگئے ہوں گے'' صادق صاحب نے باآواز بلند پوچھا۔

''ژہِ ہزلگ ہوی بلایہ مگر یم چھی نادچھن کھورژوری ژور'' (آپ کے تو ہم قربان جاتے مگر آپ کے دائیں بائیں چور ہی چور بیٹھے ہوئے ہیں) شمیم احمد شمیم نے بے ساختہ جواب دیا۔ اور خود صادق صاحب بھی بے اختیار ہنسنے لگے۔

اتفاق کی بات کہ اس وقت ان کے دائیں طرف ڈی پی در بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈی پی صاحب خفیف ہوکر اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے۔ اور شمیم صاحب سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔ آیئے آپ میری جگہ پر بیٹھ جایئے۔'' ''جی نہیں، آپ نے اس کرسی کو اس قابل ہی کہاں رکھا ہے کہ اس پر کوئی شریف آدمی بیٹھ سکے۔'' شمیم صاحب نے جواب دیا۔

گولی ماردو

جن سنگھ کے شیو چرن گپتا بجٹ پر تقریر کر رہے تھے۔ کہ انہوں نے سرینگر سے شائع ہونے والے روزنامہ 'چنار' کی نمائش شروع کر دی۔ انہوں نے شکایت کی یہ اخبار صرف دو ڈھائی ماہ سے نکل رہا ہے لیکن ایک منسٹر صاحب کی وجہ سے اسے دھڑا دھڑ اشتہارات ملنے شروع ہو گئے ہیں۔

ممبروں کو ایک اخبار دکھاتے ہوئے گپتا صاحب نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا کہ اس اخبار میں شیخ محمد عبداللہ کے بیانات بھی چھپتے ہیں۔

''تو پھر اس کے پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کو گولی ماردینا چاہیئے'' شمیم صاحب نے تجویز پیش کی۔

''شکر ہے آپ نے ہماری ایک بات سے تو اتفاق کیا'' شیو چرن گپتا نے سنجیدگی سے شمیم صاحب کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔

خاندانی طبلچی

''اس بات کیلئے آپ بھی واویلا کیجیئے، ہم بھی واویلا کریں گے، شری ڈی پی در سوالات کے گھنٹے کے دوران ایک ممبر کی تشفی کر رہے تھے۔

''آپ کیوں واویلا کرنے لگے۔ آپ ہی کی بدولت تو یہ سب کچھ تو ہوا ہے۔ واویلا ہم کریں گے''، شمیم احمد شمیم نے مداخلت کی

''جی ہاں! آپ واویلا کیجیئے۔ میں طبلے پر سنگت کروں گا۔ ڈی پی صاحب نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہاں کیوں نہیں، وہ تو آپ کا آبائی پیشہ ہے''

شمیم صاحب نے انکشاف کیا۔

خاموشی کی داد

نیشنل کانفرنس کے پیر محمد یحیٰ صدیقی عام طور پر آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ لیکن جب وزیر ٹرانسپورٹ کنور رنجیت سنگھ جموال نے ایک سوال کے متضاد جوابات دئے۔ تو پیر صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ بدقسمتی سے کانگریس کے ایس کے کول نے منسٹر کی وکالت میں کچھ کہہ دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ صدیقی صاحب کی قیادت میں نیشنل کانفرنس کا سارا گروپ ان پر ٹوٹ پڑا۔ چیخ وپکار کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ سپیکر صاحب بھی بے بسی کے عالم میں یہ تماشا دیکھتے رہے کچھ دیر بعد شمیم احمد شمیم اپنی نشست پر کھڑے ہوئے۔

"جناب والا" انہوں نے بآواز بلند کہا۔ ایوان پر خاموشی طاری ہوگئی۔ اور سب ممبران ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ "مجھے اس بات کے لئے داد دیجئے۔ کہ ایسا موقع ملنے کے باوجود میں خاموش رہا۔ شمیم صاحب کے اس فقرے نے سارا ماحول بدل دیا اور صدیقی صاحب بھی ہنسنے لگے۔

پرانے خیالات

ڈپٹی وزیر تعلیم شری نور محمد تعلیم سے متعلق مطالبات زر پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔ ان کی تقریر جب طویل سے طویل ہونے لگی۔ تو شمیم احمد شمیم نے ڈپٹی سپیکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ ڈپٹی منسٹر صاحب سے یہ پوچھ لیجئے کہ وہ کتنے دنوں بولتے رہیں گے۔

''اب تھوڑی رہ گئی ہے۔'' نور محمد نے جواب دیا۔ اور پھر خود ہی کہنے لگے ''معاف کیجئے، مذاق بہت پرانا ہے۔''

''مطمئن رہیے، آپ کے خیالات بھی اتنے ہی پرانے ہیں'' شمیم صاحب نے جواب دیا۔

ناقابلِ معافی

''میں اس کیلئے معافی چاہتا ہوں'' ڈی پی درسوالات کے گھنٹے کے دوران اپنی کسی حماقت کیلئے ایک ممبر سے معافی مانگ رہے تھے۔

ممبر صاحب نے پھر اعتراض کیا، تو سپیکر صاحب نے کہا کہ اب جب منسٹر صاحب معافی مانگ رہے ہیں تو اس بات کو چھوڑ دیجئے۔

''جناب یہ آدمی پچاس بار معافی مانگ چکا ہے، اس کا کیا بھروسہ''، شمیم احمد شمیم بولے۔

''مگر آپ نے ایک بار بھی معاف نہیں کیا ہے'' ڈی پی صاحب نے فریاد کی۔

نمائندگی

وزیر صحت محمد ایوب خان اپنے محکمہ جات سے متعلق مطالبات زر پر بحث کا جواب دیتے ہوئے فیملی پلاننگ کی اہمیت پر زور دے رہے تھے کہ ایک ممبر نے تجویز پیش کی، کہ فیملی پلاننگ کا آغاز اس ایوان سے ہونا چاہیے:۔

صادق:- آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس ایوان کے ممبروں کی تعداد کم کرنا دینا چاہیے۔

سری کنٹھ کول:- میرا مطلب ہے کہ ممبروں کو اپنے گھروں میں فیملی پلاننگ شروع کرنا چاہیے۔

محمد ایوب خان:- کئی معزز ممبران نے اس میں پہل کی ہے۔

راجپوری صاحب:- مگر وزیر صاحبان نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی ہے۔

صادق صاحب:- اس میدان میں سپیکر صاحب سارے ایوان کی نمائندگی کرتے ہیں (قہقہہ)

چھکڑا صاحب

"کسانوں سے زبردستی غلہ وصول کر کے مجوزہ سسٹم کی یاد تازہ کردی گئی"، نیشنل کانفرنس کے سردار سریندر سنگھ ثابت کر رہے تھے۔

"شیم، شیم"، شمیم صاحب نے آواز بلند کی۔

"آپ کو شمیم شمیم کہنا چاہیے" کار صاحب نے شگفتگی طبع کا مظاہرہ کیا۔

"پھر آپ کو کار صاحب کی بجائے چھکڑا صاحب کہنا زیادہ موزون رہے گا۔"، شمیم صاحب نے جواب دیا۔

سوچ اور وزیر

"آپ نے کہا ہے اونتی پورہ میں فائر سٹیشن ہے، آپ ذرا سوچ

کر بتائیے کہ کیا وہاں فائر سٹیشن ہے۔'' آزاد ممبر علی محمد نائیک نے وزیر مملکت عبدالغنی گونی سے پوچھا۔

''سوچ کے کیسے بتا سکتے ہیں؟ سوچتے تو وزیر کیسے بنتے ؟'' شمیم صاحب نے نائیک صاحب کی معلومات میں اضافہ کیا۔

پیشینگوئی

''اس کام کو ہم اگلے سال شروع کریں گے۔'' وزیر ٹرانسپورٹ و تعمیرات عامہ کنور رنجیت سنگھ جموال نے جن سنگھ کے شیو چرن گپتا کو یقین دلایا۔

''مگر، اگلے سال تو آپ وزیر ہونگے ہی نہیں، اگلے سال تک میری حکومت ہوگی اور میں آپ کو وزیر بناؤں گا نہیں'' شمیم احمد شمیم نے اعلان کیا۔

صادق:- آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس ایوان کے ممبروں کی تعداد کم کرنا دینا چاہیے۔

سری کنٹھ کول:- میرا مطلب ہے کہ ممبروں کو اپنے گھروں میں فیملی پلاننگ شروع کرنا چاہیے۔

محمد ایوب خان:- کئی معزز ممبران نے اس میں پہل کی ہے۔

راجپوری صاحب:- مگر وزیر صاحبان نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی ہے۔

صادق صاحب:- اس میدان میں سپیکر صاحب سارے ایوان کی نمائندگی کرتے ہیں (قہقہہ)

چھکڑا صاحب

''کسانوں سے زبردستی غلہ وصول کر کے مجوزہ سسٹم کی یاد تازہ کر دی گئی''، نیشنل کانفرنس کے سردار سریندر سنگھ ثابت کر رہے تھے۔

''شیم، شیم''، شمیم صاحب نے آواز بلند کی۔

''آپ کو شمیم شمیم کہنا چاہیے'' کار صاحب نے شگفتگی طبع کا مظاہرہ کیا۔

''پھر آپ کو کار صاحب کی بجائے چھکڑا صاحب کہنا زیادہ موزون رہے گا۔''، شمیم صاحب نے جواب دیا۔

سوچ اور وزیر

''آپ نے کہا ہے اونتی پورہ میں فائر سٹیشن ہے، آپ ذرا سوچ

کر بتائیے کہ کیا وہاں فائر سٹیشن ہے۔'' آزاد ممبر علی محمد نائیک نے وزیر مملکت عبدالغنی گونی سے پوچھا۔

''سوچ کے کیسے بتا سکتے ہیں؟ سوچتے تو وزیر کیسے بنتے ؟'' شمیم صاحب نے نائیک صاحب کی معلومات میں اضافہ کیا۔

پیشینگوئی

''اس کام کو ہم اگلے سال شروع کریں گے۔'' وزیر ٹرانسپورٹ و تعمیرات عامہ کنور رنجیت سنگھ جموال نے جن سنگھ کے شیو چرن گپتا کو یقین دلایا۔

''مگر، اگلے سال تو آپ وزیر ہونگے ہی نہیں، اگلے سال تک میری حکومت ہوگی اور میں آپ کو وزیر بناؤں گا نہیں'' شمیم احمد شمیم نے اعلان کیا۔

○

سوالات کے گھنٹے میں ریاستی اخبارات کے متعلق ایک سوال پر بڑی لے دے ہوئی ۔ پیر مبارک شاہ قادری ، غازی عبدالرحمان ، سریندر سنگھ اور شمیم احمد شمیم نے وزیر اطلاعات پر ضمنی سوالات کی بوچھاڑ کر دی ۔ شمیم احمد شمیم کئی بار اپنی نشست پر کھڑے ہوئے ، کہ مزید ضمنی سوالات پوچھ سکیں ، لیکن سپیکر نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ۔ مسٹر شمیم نے سپیکر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے یہ مصرعہ پڑھ دیا ۔

ہزاروں ضمنی تڑپ رہے ہیں جبین نیاز میں

ایوان میں ایک زور دار قہقہہ بلند ہوا اور شمیم صاحب کو ضمنی سوال پوچھنے کی اجازت مل گئی ۔

....

جائیداد کو سرکاری تحویل میں لئے جانے کے بل پر تقریر کرتے ہوئے شمیم احمد شمیم نے وزیر اعلیٰ اور وزیر قانون پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ کانگریسی ممبران کو اپنا ملازم تصور کرتے ہیں ۔ اس پر کئی کانگریسی ممبران نے احتجاج

کیا کہ شمیم صاحب کو یہ الفاظ واپس لینے چاہئیں۔ سپیکر نے بھی انہیں یہ الفاظ واپس لینے کی ہدایت کی۔

''جناب والا! الفاظ واپس لینے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کہا کیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وزیر اعلیٰ اور وزیر قانون کانگریسی ممبران کو اپنا ملازم سمجھتے ہیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کانگریس ممبران ان کے ملازم ہیں یا یہ کہ میں ان کو ملازم سمجھتا ہوں، میں صرف وزیر قانون کی ذہنیت کی بات کر رہا ہوں اور وزیر قانون پر یہ الزام عائد کرنے کا مجھے حق حاصل ہے'' شمیم احمد شمیم نے وضاحت کر دی اور احتجاج کرنے والے کانگریسی ممبران مطمئن ہو گئے۔ اس لئے الفاظ واپس لینے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

....

ریاست میں ریشم کی صنعت کے بحران پر ایک توجہ دلاؤ نوٹس پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ شری ایس کے کول، غازی عبدالرحمان اور شیو چرن گپتا، کے علاوہ شمیم احمد شمیم نے بھی وزیر صنعت سے کچھ نرم و نازک، ریشمی سوالات کیئے، ان سوالات کا جواب ملنے پر خلافِ معمول شمیم صاحب خاموش نظر آئے تو کچھ لوگ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

I have exhausted my breif , sir,

شمیم احمد شمیم نے وضاحت کر دی اور ایوان میں بڑے زور کا قہقہہ لگا۔

....

جائیداد کو سرکاری تحویل میں لئے جانے کے بل پر تبصرہ کرتے ہوئے
آزاد ممبر شمیم احمد شمیم نے وزیر قانون شری گردھاری لعل ڈوگرہ کو بھولا ناتھ
کہا، تو سرکاری پنچوں نے سخت احتجاج کیا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ مجھے شمیم
صاحب کی زبان پر سخت اعتراض ہے اور انہوں نے جو الفاظ استعمال کئے
ہیں۔ وہ ایوان کی کاروائی سے حذف کئے جانے چاہئیں۔ شمیم صاحب نے
کہا کہ بھولا ناتھ غیر پارلیمانی نہیں ہے اور اس کے معنی میں بھولا آدمی،
معصوم آدمی، جو یہ نہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ صادق صاحب نے کہا کہ
ایوان کے سبھی ممبر جانتے ہیں کہ بھولا ناتھ کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے
اس پر شمیم احمد شمیم کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے ایک جموی ممبر چھجو رام نے کہا کہ
بھولا ناتھ بدھو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

''اگر بھولا ناتھ بدھو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، تو میں یہ لفظ واپس
لے لیتا ہوں، لیکن میرا خیال تھا کہ یہ رام ناتھ، سوم ناتھ کی طرح کوئی نام
ہوگا، شمیم احمد شمیم نے یہ لفظ واپس لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے شمیم صاحب کی زبان پر سخت اعتراض ہے اور ان کی تقریر کے
اس پورے حصے کو ایوان کی کاروائی سے حذف کر دینا چاہئے'' صادق
صاحب نے شدید غصے کی حالت میں کہا۔

''صادق صاحب کو میری زبان پر ہی نہیں، میرے وجود پر بھی
اعتراض ہے، لیکن ان کے کہنے سے نہ میری تقریر حذف ہو سکتی ہے اور نہ میرا

وجود۔اس ایوان میں سپیکر کا حکم چلتا ہے، وزیر اعلیٰ کا نہیں"، شمیم صاحب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

....

شری گردھاری لعل ڈوگرہ جائیداد سے متعلق بل پر بحث کا جواب دے رہے تھے کہ انہوں نے نیشنل کانفرنس کے غازی عبدالرحمٰن سے مخاطب ہو کر کہا کہ انہیں Fantastic باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔اس پر شمیم احمد شمیم نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ Fantastic کا لفظ غیر پارلیمانی ہے اور وزیر قانون کو یہ لفظ واپس لینا چاہیے۔سپیکر نے فیصلہ لیا کہ Fantastic غیر پارلیمانی نہیں، صادق صاحب نے مزید وضاحت کی غرض سے شمیم صاحب سے پوچھا کہ آپ Fantastic کا ترجمہ کریں گے؟

"گردھاری لعل ڈوگرہ"، شمیم احمد شمیم نے جواب دیا۔

....

جن سنگھی ممبر رام ناتھ بلگوترہ نے یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کے بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"شمیم صاحب نے اُردو کی بات کی ہے۔ہم سلیس اُردو کے مخالف نہیں ہیں۔ بشرطیکہ اُردو سادہ اور سلیس ہو۔ ہم فارسی آمیز اُردو کے مخالف ہیں سیتا کو سیتا کہا جائے تو ٹھیک ہے لیکن سیتا کو اگر سیتا بیگم لکھا جائے تو یہ ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"حکم کی بیگم آپ سمجھتے ہیں"، شمیم احمد شمیم نے استفسار کیا۔

''جی ہاں سمجھتا ہوں'' بلگوترہ نے جواب دیا۔

''پھر کوئی بات نہیں، آپ سیتا بیگم بھی سمجھیں گے'' شمیم صاحب نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

....

بجلی کے میٹروں سے متعلق ایک سوال پر سوالات کے گھنٹے کے دوران مخالف ممبروں اور وزیر صنعت و بجلی غیاث الدین کے درمیان بڑی گرما گرمی ہوئی۔ مخالف ممبروں نے الزام لگایا کہ صرف غریب لوگوں کے گھروں کے باہر بجلی میٹر نصب کئے گئے ہیں۔ اعلیٰ سرکاری ملازموں اور رئیسوں کے گھروں میں بدستور بجلی کے میٹر اندر ہی لگے ہیں۔ وزیر صنعت نے اس الزام کی پُرزور تردید کی۔

''اچھا یہ بتائیے کہ چیف سکریٹری کے بنگلے میں لگا ہوا میٹر مکان کے اندر ہے یا باہر'' شمیم احمد شمیم نے دریافت کیا۔

اس سوال کا جواب اجلاس ختم ہونے تک کسی نے نہ دیا۔ شاید ان کے مکان میں بجلی کا میٹر لگا ہی نہیں ہے۔

....

۲۵ ستمبر کو اجلاس کا آخری دن تھا۔ دلی سے لوٹ کر ۱۲ بجے کے قریب وزیر خزانہ شری درگا پرشاد در ایوان میں تشریف لائے۔ تو شمیم احمد شمیم نے سپیکر سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جناب والا! ڈی پی صاحب روس میں ہندوستان کے سفیر متعین

ہوئے ہیں۔ اور اگلے اجلاس میں ان سے ملاقات نہ ہوگی۔ مناسب ہوگا کہ آج اجلاس ختم ہونے سے پہلے ایوان کا ایک پرانا ممبر ہونے کے ناطے انہیں الوداع کہا جائے۔"

"مجھے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے اور یہ تعزیتی قرارداد کسی حد تک قبل از وقت ہوگی" ڈی پی صاحب نے انکسار سے کہا۔

"ریزولیوشن ابھی پاس ہونے دیجئے۔ بعد میں اس سے Retrospective effect دیں گے" شمیم صاحب نے تجویز پیش کی۔

حملے اور جوابی حملے

ضلع اننت ناگ کے نامعلوم حلقہ انتخاب سے بلا مقابلہ کامیاب شدہ ممبر اسمبلی پیر حسام الدین اسمبلی میں بڑھ بڑھ کر باتیں کررہے تھے، مخالف ممبروں کے ساتھ ایک شدید نوعیت کی جھڑپ کے دوران وہ بڑے زوروں سے چلانے لگے، تو شمیم احمد شمیم نے کہا۔

''چلاتے کاہے کو ہو، تمہارا اور ہمارا کیا مقابلہ، تمہیں خالق نے بنایا ہے ہمیں مالک نے بنایا ہے'' اس کے بعد پیر صاحب کی بولتی بند ہوگئی۔

....

اسمبلی میں گورنر کے ایڈریس پر بحث کے دوران اننت ناگ کے ڈپٹی کمشنر عبدالخالق کا نام اتنی مرتبہ لیا گیا کہ پریس گیلری میں بیٹھے ہوئے ایک اخباری نمائندے نے مجھ سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ یہ بحث گورنر کے ایڈریس پر ہورہی ہے، یا مسٹر خالق کے ایڈرس پر...... شمیم احمد شیم نے تمام بلا مقابلہ کانگریسی ممبروں کو میڈ ان خالق Made in Khaliq قرار دے کر انہیں خاموش کردیا۔

....

گورنر کے ایڈرس پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے آزاد ممبر شمیم احمد شمیم نے کہا کہ میں گورنر شری بھگوان سہائے اور وزیر اعلیٰ کے لئے ایک تحفہ لایا ہوں، اور میں آنریبل سپیکر کی وساطت سے یہ ان تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے لفافے میں سے دو بیلٹ پیپر نکال کر ممبروں کو دکھائے، اور سپیکر صاحب سے گذارش کی کہ یہ تحفے وہ گورنر صاحب تک پہنچا دیں، تاکہ انہیں انتخابات کے آزادنہ اور منصفانہ ہونے کا مکمل یقین ہوجائے۔

....

بلا مقابلہ کامیاب ہونے والے ایک کانگریسی ممبر Made in Khaliq) شری مکھن لعل فوطیدار بڑے جوش میں آکر انتخابات کے ''آزادانہ'' اور ''منصفانہ'' ہونے کا اعلان کررہے تھے۔ کہ شمیم احمد شمیم نے دو بیلٹ پیپروں کی دوبارہ نمائش شروع کردی۔ ایوان کے سبھی ممبر فوطیدار صاحب کی تقریر سننے کے بجائے شمیم صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔ اس پر پردیش کانگریس کے صدر سید میر قاسم کو تاؤ آیا۔ اور انہوں نے کہا ''ہمیں کیا معلوم یہ ووٹ اصلی ہیں یا نقلی ؟'' آپ سے بہتر کون جانتا ہے، اصلی ہیں یا نقلی۔ آپ ہی کی نگرانی میں تو تقسیم ہوئے ہیں، شمیم صاحب نے جواب دیا۔

....

ریاست کے سابق وزیر اعظم خواجہ شمس الدین احتیاطی نظر بندی میں

ترمیمی بل پر تقریر کر رہے تھے، تقریر کرتے کرتے آپ نے مغل روڈ کا ذکر شروع کر دیا، پھر کہنے لگے کہ انتخابات کے دوران پاکستانی تخریب کاروں نے یہاں خطرناک قسم کی سرنگیں بچھادی تھیں اور اس طرح انتخابات میں حصہ لینے والوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالی تھیں۔

"آپ تو بہر حال محفوظ رہے، کیونکہ آپ کو الیکشن لڑنا ہی نہیں پڑا، یہ سب کچھ تو ہمارے لئے .... شمیم صاحب نے کہا۔

شمس صاحب کو عبدالخالق کی مہربانی یاد آئی، اور انہوں نے احتیاطی نظر بندی میں توسیع کی تائید کی۔

....

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ حکومت کہاں ہے، میں انہیں بتاؤں گا کہ حکومت کہاں ہے؟" سید میر قاسم نے جوش میں آ کر کہا۔

"اس کا پوسٹل ایڈرس بھی بتایئے" شمیم احمد شمیم نے درخواست کی۔

"آپ کے لئے یہی کافی ہے۔ کہ پاکستان میں نہیں ہے، جہاں آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

یعنی کہ آپ پاکستانی ہیں......

....

"شہر کے لوگوں کو اتنا معقول اور مناسب راشن مل رہا ہے کہ اس میں تین چار سالہ بچوں کی کفالت ہو سکتی ہے۔" شری ڈی پی در نے انکشاف کیا"۔ آپ اپنے گھر کے راشن کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کو زیادہ ملتا ہو تو ہو

ہمیں تو نہیں ملتا۔'' شمیم احمد شمیم نے در صاحب کی معلومات میں اضافہ کیا۔

بہر کیف، ہم اس وقت راشن کارڈوں میں بچوں کا اضافہ نہیں کر سکتے'' ڈی، پی صاحب نے اعلان کیا۔

''ان بچوں کا جرم یہ ہے کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے، جب ڈی پی در اس ریاست کا وزیر خوراک ہے۔''

اس پر ڈی پی صاحب کو بہت سا غصہ آیا!

....

آنریبل سپیکر نے ضمنی سوال پوچھنے کے لئے شمیم احمد شمیم کا نام لیا۔ تو نیشنل کانفرنس کے سریندر سنگھ بھی کھڑے ہوگئے۔ شمیم صاحب نے کئی بار سوال پوچھنے کی کوشش کی، لیکن سریندر سنگھ نے موقع نہیں دیا۔

''رُوٹن'' شمیم صاحب کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا اور سارا ایوان قہقہوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ پورے ایک منٹ تک ایوان میں کسی ممبر کی ہنسی نہ رُک سکی۔ آنریبل سپیکر صاحب بھی اس ہنسی میں برابر کے شریک تھے۔ ''رُوٹن'' ایک خالص کشمیری اصطلاح ہے جس کا ترجمہ اُردو میں ہونا محال ہے۔

....

وزیر خوراک شری ڈی پی در تقریر کر رہے تھے اور شمیم احمد شمیم بار بار مداخلت کر رہے تھے۔ دوران تقریر ڈی پی صاحب نے کہا کہ بہت سے لوگ جلد ہی بے نقاب ہو جائیں گے۔

''آپ تو اسی وقت بے نقاب ہو رہے ہیں'' شمیم صاحب نے فقرہ کیا۔

''میں تو اس وقت بھی بے نقاب ہونے کے لئے تیار ہوں، لیکن آپ کی کمسنی کا خیال آتا ہے۔ ڈی پی صاحب نے برجستہ کہا۔

آپ کی عادت سے سب لوگ ویسے بھی واقف ہیں۔ کیوں آپ اپنے بچپن کی یاد دلانا چاہتے ہیں'' شمیم نے کہا۔

....

خواجہ شمس الدین کسی موضوع پر تقریر کر رہے تھے، کہنے لگے کہ کل ہی میرے پاس میرا ایک ریفوجی دوست آیا تھا۔ اس نے یہاں مکان بنایا ہے۔ اس کے پاس گاڑیاں ہیں۔ لیکن وہ مجھ سے کہہ رہا تھا، کہ وہ کون سا دن ہوگا، جب وہ مظفر آباد میں اپنی کٹیا دیکھ سکے، اور اس زمین پر قدم رکھ سکے، جہاں اس نے جنم لیا ہے۔

''وہ کوئی پاکستانی جاسوس ہوگا'' شمیم احمد شمیم نے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں'' شمس صاحب نے صفائی پیش کی۔

....

پردیش کانگریس کے صدر سید میر قاسم گورنر کے ایڈرس پر شمیم احمد شمیم کی تقریر کا جواب دے رہے تھے، ان کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ ان کا چہرہ شعلے کی مانند سرخ تھا، کہنے لگے۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں''

"We want Sadiq Minus Qasim" شمیم صاحب نے جواب دیا۔

''یہ آپ کا خواب ہے'' قاسم صاحب نے کہا۔

''یہ پورا ہو کے رہے گا'' ۔شمیم صاحب نے جواب دیا۔

''یہ آپ کی بھول ہے'' قاسم صاحب غرائے

''ہم صادق صاحب کو قائل کر کے رہیں گے کہ آپ کسی کام کے نہیں ''شمیم احمد شمیم نے دعویٰ کیا۔

جواب دیجئے؟

آپ ایک مسلمان پروفیسر ہیں

آپ کے پاس ایک مسلمان ایک ہندو اور ایک سکھ طالب علم کی امتحانی کاپیاں آئی ہوئی ہیں۔ اور آپ کو ان کاپیوں پر نمبر دینے ہیں۔ آپ کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا اور آپ کے دئے ہوئے نمبر ان طالب علموں کے مقدر کو بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ مختلف سوالات کے نمبر جمع کرتے وقت ہندو اور مسلمان طالب علم کے درمیان دو نمبروں کا فرق رہ جاتا ہے۔ یعنی اگر آپ مسلمان طالب علم کو دو نمبر اور دیں تو وہ ہندو طالب علم پر سبقت لے جائیگا۔ اس مرحلے پر آپ کیا کریں گے؟

آپ ایک ہندو افسر ہیں

اور آپ کے ماتحت کئی مسلمان اور ہندو افسر کام کر رہے ہیں۔ آپ کو ان افسروں کا سی آر (کانفیڈنشنل رول) لکھنا ہے۔ آپ کی رائے حتمی ہے اور کوئی اسے بدل نہیں سکتا۔ آپ ہندو افسر کی کارکردگی سے مطمئن نہیں اور مسلمان افسر کی اہلیت سے متاثر ہیں، لیکن چند سال قبل ایک مسلمان افسر

نے آپ کو سخت تکلیف دی ہے۔اب بدلہ چکانے کا وقت آ گیا ہے۔آپ کیا کریں گے؟

آپ ایک مسلمان ڈاکٹر ہیں

آپ نے اپنی آنکھوں سے ایک ہندو ڈاکٹر کو مسلمان مریضوں کے ساتھ بے رحمی اور بے دردی سے پیش آتے دیکھا ہے۔آپ کے پاس ایک ہندو مریض آیا ہوا ہے جو درد سے کراہ رہا ہے۔آپ ایک مسلمان مریض کا معائینہ کرنے والے ہیں۔ ہندو مریض کے درد کی شدت ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے اور آپ کو ہندو ڈاکٹر کا رویہ یاد آتا ہے۔آپ اس مرحلے پر کیا کریں گے؟

آپ ایک ہندو (وکیل) ہیں

آپ کا موکل مسلمان ہے جس نے ایک ہندو کے خلاف دعویٰ دائر کیا ہے۔مخالف وکیل بھی ہندو ہے۔مسلمان کا مقدمہ بہت مضبوط ہے لیکن آپ کی ذراسی عدم توجہی سے وہ یہ مقدمہ ہار سکتا ہے اور پچھلے ہفتے جب آپ گھر سے باہر آرہے تھے تو آپ نے اپنے موکل کو ہندوؤں کیخلاف نعرے لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔حساب چکانے کا وقت آ گیا ہے۔آپ کیا کریں گے؟

آپ ایک مسلمان تھانیدار ہیں

کل امیرا کدل جاتے ہوئے آپ نے ایک غریب مسلمان کو ہندو غنڈوں کے چنگل سے چھڑالیا۔آپ وہاں سے نہ گذرتے تو ہندو غنڈے

غریب مسلمان کو قتل کیئے بغیر نہ چھوڑتے ۔ آج آپ کے تھانے سے کچھ فاصلے پر کچھ مسلمان غنڈے ایک ہندو نوجوان کو بُری طرح پیٹ رہے ہیں۔ اگر آپ مداخلت نہ کریں تو ہندو نوجوان کو مار دیا جائے گا۔ آپ کی نگاہوں میں کل کا واقعہ پھر جاتا ہے۔ بتایئے آپ کیا کریں گے؟

آپ ایک ہندو دکاندار ہیں

اس بازار میں جہاں آپ کی دُکان ہے، صرف ایک مسلمان دکاندار ہے۔ یہ مسلمان دکاندار بڑا ہی بھلے مانس ہے، لیکن ہندوؤں کو یہ خبط ہو جاتا ہے کہ اس مسلمان دکاندار کی دکان لوٹ لی جائے۔ اس لوٹ سے آپ کی دکان داری کو خاصا فائدہ ہوگا۔ کیونکہ مقابلہ کم ہو جائیگا۔ آپ عین وقت پر پولیس کو مطلع کریں تو دکان لٹنے سے بچ سکتی ہے۔ آپ کیا کرینگے۔

آپ ایک مسلمان دکاندار ہیں

آپ کی آنکھوں کے سامنے کچھ مسلمان ایک ہندو پڑوسی کی دُکان لوٹ رہے ہیں۔ یہ سب لٹیرے اسی محلے کے رہنے والے ہیں اور آپ ان کو اچھی طرح جانتے ہیں کچھ دیر بعد پولیس موقعہ پر پہنچتی ہے اور آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ لوٹ کرنے والے کون تھے۔ اب آپ کیا کریں گے؟

آپ ایک ہندو اخبار نویس ہیں

اور آپ سے کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں مندر سے مورتی چرا کر پجاری کو گولی ماردی گئی ہے۔ آپ کا اخبار پریس میں جاری رہا ہے۔ اس خبر کی

اشاعت سے پورے شہر میں سنسنی پھیل جائیگی، لیکن اس خبر کی تصدیق کے لئے کچھ وقت درکار ہے اور اِدھر اخبار چھپنے میں دیر ہو جائیگی۔ آپ کیا کرینگے؟

آپ ایک مسلمان اخبارنویس ہیں

ایک معمولی سے واقعہ پر سنسنی خیز سرخیاں چڑھا کر آپ کے اخبار کی تین سو سے زائد کاپیاں بکنے کا امکان ہے لیکن ساتھ ہی فضا میں کشیدگی پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ آپ کیا کریں گے؟

نثار میں تیری گلیوں کے
اے وطن کہ جہاں

☆ جمہوریت کے نام پر شیطانیت ، مذہب کے نام پر بے ایمانی ، انصاف کے نام پر ظلم ، اخلاق کے نام پر بے حیائی ، لباس کے نام پر عریانی ، تعلیم کے نام پر جہالت ، شرافت کے نام پر بے حیائی اور سیاست کے نام پر چنگیزی کا دور دورہ ہے۔

☆ وزیر چور ، امیر چور ، غریب کام چور ، عوام بجلی چور ، خواص ٹیکس چور ، جج ووٹ چور ، باپ چٹ خور ، بیٹا چغل خور ہے۔

☆ انجینئرنگ کالج کا پرنسپل انجینئر نہیں بلکہ ایک جغرافیہ دان ہے۔ امراض سینہ کے اسپتالوں کا سپرنٹنڈنٹ ماہر امراض سینہ نہیں ایک ایل ایم پی ہے۔

☆ گوشت کی قیمتوں میں ہر پندرہ دن بعد اضافہ ہوتا رہتا ہے اور سپلائز کا کمشنر ہر ہفتے قصائیوں کی میٹنگ بلا کر اس قیمت پر سرکاری مہر ثبت

کرتا ہے۔

☆ مظفر جان جیسے درانداز اپنے ابا جان کے طفیل جوڈیشری کی سرحدوں میں داخل ہو کر اس کے وقار کو خاک میں ملاتے ہیں۔

☆ معاہدہ شقند کے باوجود ریڈیو کشمیر سے ''وادی کی آواز'' کا پروگرام نشر کرنے کی حماقت جاری ہے۔

☆ ٹیکسی والا میٹر کی بجائے اپنی مرضی کے مطابق کرایہ وصول کرتا ہے۔

☆ خوش خرید کے نام پر مجوزہ وصول کیا جا رہا ہے اور بڑے دھڑے سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کسان اپنی مرضی سے شالی جمع کروا رہے ہیں۔

☆ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے والوں کو رشوت اور بے گناہوں کو قید کی سزا دی جاتی ہے۔

☆ یونیورسٹی کو ایک فضول ادارہ تصور کر کے اسے نا اہل اور نالائق افسروں اور استادوں کی چراگاہ بنا دیا گیا ہے۔

☆ جنگلات کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچانے والے تو وزیروں کے دوست ہیں لیکن سوکھی لکڑی کا ایک ٹکڑا اُٹھانے والے دیہاتیوں کو قید اور جرمانے کی سزا دی جاتی ہے۔

☆ ابھی تک ان مصیبت زدوں کو کوئی ریلیف نہیں دی گئی ہے جن کے مکانات پچھلے سال بھونچال میں منہدم یا شکستہ ہو چکے ہیں۔

☆ اسپتالوں میں بڑے بڑے ڈاکٹر مریضوں سے نذرانے وصول

کرنے کے بعد ہی ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

☆ گیٹ کنٹرول آڈر کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں اور بڑے بڑے لیڈر اور سرکاری افسر بہ نفس نفیس اس آڈر کی خلاف وزری کا فریضہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

☆ لڑکیاں اس قدر چست لباس پہننے ہوئے نظر آتی ہیں کہ دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں کہ یہ اس لباس میں گھس کیسے گئی ہیں۔

☆ نئے نئے علاقوں کو بجلی کی روشنی مہیا کی جارہی ہے لیکن جہاں بجلی کی رو پہلے سے موجود ہے۔ وہاں بجلی کی روشنی عنقا ہوتی جارہی ہے۔

☆ جلسوں، مجلسوں، محفلوں اور تقریروں میں سب لوگ ہندو مسلم اتحاد کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن گھر جا کر اپنے بچوں کو فرقہ وارانہ منافرت، تعصب اور تنگ نظری کا سبق پڑھاتے رہتے ہیں۔

☆ جامعہ ملیہ علی گڈھ کے امتحانات میں پاس ہونے کے لئے نقل، نقد اور نقب کی تمام سہولیات میسر ہیں اور جامعہ والے بڑے مزے سے اُردو کی آبرو لوٹ کر اپنے گھر تعمیر کر رہے ہیں۔

☆ سرکاری زبان تو اُردو ہے، لیکن اس کے نشو ونما یا فروغ کے لئے چار پیسے خرچ کرنا ایک اخلاقی جرم تصور کیا جاتا ہے۔

☆ سرکاری افسر کھلے بندوں سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں حصہ لیں تو انہیں ترقی دے کر نوازا جاتا ہے۔

☆ ہر سیاسی جماعت اپنے آپ کو چالیس لاکھ عوام کی نمائندہ سمجھتی ہے

حالانکہ آبادی ۳۵ لاکھ سے زیادہ نہیں۔

☆ انتخابات میں بے ایمانیاں کر کے جیت جانا ہند کشمیر الحاق کو وٹامن کھلانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

☆ ایسے ایسے جج انصاف کی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ جنہیں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہونا چاہیے تھا۔

☆ ریگل سنیما کا افتتاح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے اور اس کے بعد ''دنیا کی سیر'' جیسی گرم فلم دکھائی جاتی ہے۔

آئینہ ۱۹۷۴ء

شمیم احمد شمیم کے قلم سے

سفر نامہ

تیس ہزار میل سے زائد کی مسافت اور ٹھیک ساٹھ دن کی غیر حاضری کے بعد ۱۶ را اکتوبر کو میں واپس سرینگر پہنچ گیا۔ دو ماہ کے اس مختصر سے وقفے میں، میں نے تجربات، مشاہدات، تاثرات اور کیفیات کی شکل میں جو اثاثہ جمع کیا ہے، وہ میں اس اخبار کی آئندہ اشاعتوں میں، اپنے قارئین کی نذر کردوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ پڑھنے والے میرے سفر کی روداد سے محظوظ ہی نہیں، مستفید بھی ہوں گے، مشکل یہ ہے کہ دو ماہ کے اس مختصر سے سفر کی حکایت اتنی طویل ہے، کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے شروع کہاں سے اور کس انداز سے کروں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اپنے سفر کے آغاز سے ابتداء کر کے اپنی واپسی تک کا احوال روزانہ ڈائری کی شکل میں پیش کروں۔ لیکن یہ خاصا پرانا سٹائل ہے۔ اور اِس میں ہر بات کو خواہ مخواہ طول دینے کی بدعت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں دو تین قسطوں میں اپنے تجربات اور تاثرات بیان کر کے قصہ ختم کردوں۔ لیکن

میں صرف اپنے تجربات بیان کرنا نہیں چاہتا، میں پڑھنے والوں کو ان میں شریک کرنا چاہتا ہوں، اس لئے اختصار سے بھی بات نہ بنے گی، تیسری صورت یہ ہے کہ میں اپنے تاثرات مختلف عنوانات کے تحت قلم بند کروں، اور اس طرح مغرب کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آپ کو روشناس کر دوں۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ دو ماہ کے ہوائی سفر کے بعد میں اپنے آپ کو امریکہ اور انگلستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی پر کوئی فیصلہ کُن رائے دینے کے اہل نہیں سمجھتا، میرے تاثرات اور میری کیفیات بہرحال میرے ذہن، میری ذات اور میرے تعصّبات کے آئینہ دار ہوں گے، اور میں آپ کو اور اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ کہ میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ وہی حرف آخر اور مکمل صداقت ہے۔ اگرچہ میں اس بات کی حتی الامکان کوشش کروں گا کہ میرے تجربات پر میرے تعصّبات اور تصورات کا کم سے کم سایہ پڑے! اب ایک اور صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ میں عنوان اور اسلوب کا فیصلہ کئے بغیر لکھنا شروع کر دوں۔ اور جس طرح بہتا ہوا پانی خود اپنا راستہ متعین کر دیتا ہے۔ اسی طرح میری حکایت بھی خود ہی کوئی اسٹائل اپنا لے گی، یہ صورت مجھے سب سے بہتر نظر آتی ہے اور میں اپنے سفر نامے میں یہی تیکنک استعمال کروں گا۔

اپنے سفر کی روداد بیان کرنے سے پہلے میں اُن تمام دوست واحباب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، کہ جنہوں نے میرے عزم سفر کو پایۂ تکمیل تک

پہنچانے اور میرے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے میں میری بھرپور امداد کی۔ ان کی بے لوث محبت، بے پایاں خلوص اور مہمان نوازی کے بغیر یہ طویل سفر اور انتہائی مفید سیاحت یقیناً ممکن نہ ہوتی۔ اور مجھے اپنی زندگی میں ہمیشہ ایک تشنگی کا احساس رہتا احباب کی اِس طویل فہرست میں کلکتہ کی مسز آوا بھسین اور ان کے شوہر مسٹر دیوراج بھسین کا نام سرفہرست ہے، کہ جن سے میری اتفاقیہ ملاقات آج سے سولہ برس پہلے ہوئی تھی اور جن کی بے لوث محبت نے مجھے کبھی تنہائی یا بے بسی کا احساس نہیں ہونے دیا، فہرست میں دوسرا نام میرے نوجوان دوست ڈاکٹر موتی پنجابی کا ہے، کہ جن سے میری ملاقات اسی سال مئی کے مہینے میں ہوئی تھی۔ موتی الاباما یونیورسٹی میں پروفیسر ہے اور اس نے امریکہ جیسے برق رفتار اور سرد مہر ملک میں، میری وہ مہمان نوازی کی، کہ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے پایا۔ اس کے بعد امریکہ کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ان کشمیری نوجوانوں کا نام آتا ہے، کہ جنہوں نے میری نیویارک میں آمد سے لیکر روانگی تک ہر گام اور ہر منزل پر میری وہ پذیرائی اور خاطر تواضع کی، کہ میں عمر بھر ان کی محبت کا قرض ادا نہیں کرسکتا۔ نیویارک میں میرے میزبان غلام محمد جیولر کے صاحبزادے فاروق کاٹھواری اور ان کے دو چھوٹے بھائی طارق اور رفیق تھے کیلی فورنیا میں مسٹر جی ایم بٹ کے صاحبزادے ڈاکٹر حسن اور ان کی اہلیہ، شگاگو میں پروفیسر شمبھن کشن کول کے داماد مسٹر موہن بامزئی، بفیلو میں ڈاکٹر گردھاری لال ہانجورہ اور ڈاکٹر قیوم فاضلی، الی نائس یونیورسٹی اربانا

میں ڈاکٹر برج بہاری کاچرو اور مسٹر گردھاری لال تکو، بوسٹن میں مسٹر جانکی ناتھ زتشی کے صاحبزادے ڈاکٹر مدن زتشی، لندن میں ڈاکٹر شنکر رینہ مسٹر مہندر کول اور خورشید درابو، اس فہرست میں اور بھی بہت سے نام ہیں جنہوں نے میرے سفر کو آرام دہ اور خوشگوار بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی، مثلاً غلام محمد چکن کے صاحبزادے ڈاکٹر عطاءاللہ نے مسوری آنے کی بار بار دعوت دی۔ اور اس خیال سے کہ شاید میرے پاس زادِ راہ نہیں ہوگا۔ مجھے ایک سو ڈالر کا چیک بھی بھیج دیا، اسی طرح انڈین کونسلیٹ کے پبلک ریلیشنز آفیسر مسٹر جے، این بھٹ (جو بانڈی پورہ کے رہنے والے ہیں) نے مجھے اپنا مہمان بنا کر میری بڑی خاطر مدارت کی، اور اس طرح دیارِ غیر میں بھی میرے بھائیوں نے مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا۔ کہ میں اپنے وطن سے پندرہ ہزار میل دور ہوں!

میرے اس سفر کے دو مقصد تھے، ایک تعلیم، دوسرا تفریح، اور مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ کہ دو ماہ کے مختصر سے وقفے میں یہ دونوں ہی مقصد بہت حد تک پورے ہو گئے ہیں، میں نے اپنا زیادہ وقت امریکہ کی یونیورسٹیاں دیکھنے میں صرف کیا۔ اور میں اپنا یہ فوری تاثر ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے امریکی یونیورسٹیوں نے بے حد متاثر کیا۔ اور ان کے علمی ماحول، تہذیبی فضا اور ان میں تربیت پانے والے نوجوانوں کی سنجیدگی اور ذہنی بلوغت کا جب میں اپنے ہاں کی یونیورسٹیوں سے مقابلہ کرتا ہوں، تو مجھے بے حد مایوسی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ امریکہ کی سب سے بڑی

طاقت ایٹم بم نہیں، بلکہ وہاں کی یونیورسٹیاں ہیں۔ اور ہمارے ملک کی سب سے بڑی کمزوری ہماری نام نہاد یونیورسٹیاں ہیں، بہر حال، اس کا مفصل ذکر مناسب وقت پر ہوگا۔ اور اس مرحلے پر میں صرف یہ کہنے پر ہی اکتفا کروں گا کہ امریکہ کی یونیورسٹیاں امریکہ کا سب سے قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ سفر بجائے خود ایک بہت مفید اور نادر تجربہ ہے۔ اور امریکہ جیسے وسیع ملک میں آنکھیں کھول کر گھومنے پھرنے سے انسان کی بصیرت اور بصارت دونوں میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے۔ میں ۱۹۷۱ء میں بھی ایک ڈیڑھ ہفتے کے لئے امریکہ گیا تھا۔ لیکن تب میں نے اپنا سارا وقت نیویارک میں گزارا تھا۔ اور صرف نیویارک کو دیکھ کر امریکہ کی وسعت، اس کی تہذیبی رنگارنگی اور اس کی سیاست کا بھرپور اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اب کی بار میں نے زیادہ وقت نیویارک سے باہر، امریکہ کے دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں گزارا، اور مجھے کسی حد تک امریکی سیاست اور معاشرت کا اندازہ ہوا ہے، لیکن میں اپنے سفرنامے میں، ان باتوں کا ذکر نہیں کروں گا کہ جن کے متعلق آپ اخبارات اور رسائل کے ذریعے معلومات فراہم کر سکتے ہیں، میں اُن چھوٹی چھوٹی، بظاہر غیر اہم اور معمولی باتوں پر اپنی توجہ مرکوز کروں گا۔ کہ جوان لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی کہ جو آج تک کبھی امریکہ نہیں گئے ہیں اور جن کے مستقبل قریب میں وہاں جانے کا کوئی امکان نہیں، میری کوشش یہ ہوگی کہ میرے سفر کی روداد پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو کہ وہ میرا ہم سفر ہے، میں اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہوں، اس کا فیصلہ آپ خود کر سکیں گے!

امریکہ میں اپنی سیاحت کے دوران مجھے کئی بار ٹیلی ویژن پر انٹرویو دینے کے علاوہ دو یونیورسٹیوں میں تقریر کرنے کی بھی دعوت دی گئی۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی (سین ڈیاگو) میں میرے ایک علی گڈھ کے ہمعصر عابداللہ غازی پروفیسر ہیں۔ میں ان کی دعوت پر وہاں گیا، تو انڈین ایسوسی ایشن نے میرے اعزاز میں ایک استقبالیہ دعوت دی۔ اور میں نے ''مسئلہ کشمیر...... ماضی، حال اور مستقبل'' کے موضوع پر تقریر کی، اسی طرح یونیورسٹی آف الی نائس (اربانا) میں بھی ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا رول، کے موضوع پر میری تقریر کا اعلان ہوا تھا۔ اور اس میں بہت سے پاکستانی طالب علم بھی شریک ہوئے، تقریروں کے بعد امریکی طالب علموں اور پروفیسروں نے جو سوالات کئے، ان سے اندازہ ہوا کہ کشمیر کے متعلق ان لوگوں کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک طالب علم مجھ سے مہاراجہ ہری سنگھ کی خیر و خیریت پوچھنے لگے، اور دوسرے کا خیال تھا کہ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے۔ ان کی اس جہالت اور لاعلمی سے میری انّا کو ٹھیس پہنچی۔ کیونکہ ہر کشمیری کی طرح میں بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ کہ امریکہ کے لوگ نہ صرف ہم سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ بلکہ ہمارے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ اس سے زیادہ دُکھ مجھے اس بات سے ہوا کہ امریکہ میں بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کشمیر دنیا میں سب سے خوبصورت اور دلکش وادی ہے۔ اور عام امریکی سیاح صرف آگرہ کے تاج محل اور اودھے پور کے ہوا محل کے بارے میں جانتا ہے۔ کشمیر کو سیاحت کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے بین الاقوامی

سطح پر نظر انداز کئے جانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس کا سراغ لگانے کی سخت ضرورت ہے۔ میں ایک بار ٹیلی ویژن پر دنیا کے اہم ترین سیاحتی مرکزوں کے بارے میں ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس میں کشمیر کے خوبصورت مناظر کا بھی عکس دکھایا جائے گا۔ لیکن میری حیرت اور مایوسی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جب آگرہ کے تاج محل اور اُودھے پور کے ہوا محل کے ذکر کے بعد کیمرہ ہندوستان سے جاپان پہنچ گیا!

دراصل ہندوستان اور پاکستان کے متعلق عام لوگوں کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہندوستان کے متعلق امریکی عوام صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک بے حد غریب ملک ہے اور وہاں سخت بھکمری کا عالم ہے، میں جس روز واشنگٹن میں ہندوستانی سفیر مسٹر ٹی این کول کا مہمان تھا۔ اسی دن نیو یارک ٹائمز میں کلکتہ کے خوفناک غذائی قحط اور فٹ پاتھ پر پلنے والے بچوں کی دل سوز کہانی شائع ہوئی۔ اس کے ساتھ بھوک سے نڈھال ان تین بچوں کی تصویریں بھی شامل تھیں کہ جو سڑک پر بیٹھے بھیک مانگ رہے تھے۔ اسے پڑھ کر کول صاحب کو بہت غصہ آیا، کہ ان خبیث امریکہ اخبار نویسوں کو ہندوستان میں بھوک کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور میں یہ سوچنے لگا کہ حقیقت کتنی تلخ اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش کے بارے میں بھی بڑی تشویشناک اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات پڑھ کر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بنگلہ دیش چند مہینوں کا مہمان ہے اور وہاں کا سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ کسی بھی وقت دم توڑ دے گا۔

امریکہ اور یورپ میں اگر آج کل کسی ملک یا قوم کی عزت اور اہمیت ہے تو وہ ہے عرب ممالک، جنہوں نے تیل کا ہتھیار استعمال کر کے، امریکہ کے سارے ہتھیار بے کار بنا دیئے ہیں۔ بہت دنوں بعد امریکیوں کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ان کی ساری ٹیکنالوجی اور ترقی کی بنیادیں عربوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا، کہ وہ عربوں کو کس طرح خوش رکھیں۔ کبھی کبھی سخت غصے کے عالم میں وہ دھمکیوں پر اُتر آتے ہیں۔ لیکن پھر خود ہی انہیں یہ احساس ہو جاتا ہے، کہ دھمکیوں سے کام نہیں چلے گا اور وہ عربوں کی خوشامد کرنا شروع کرتے ہیں۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ عرب پہلی بار سوچ سمجھ کر اپنی خداداد دولت اور طاقت کا استعمال کر رہے ہیں اور ان کی کامیاب حکمتِ عملی سے مسلمانانِ عالم کی عزت اور اسلام کے وقار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ امریکی یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب سے ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور اسلامی تعلیم اور فلسفے کا مطالعہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۱۹۷۴ء

باب اوّل

۲۰ راگست کی رات کو جب ساری دِلّی سو رہی تھی تو پالم کا ہوائی اڈہ جاگ رہا تھا۔ صبح کے ۳ بج رہے تھے، اور ائر پورٹ پر ایک شور وغل برپا تھا۔ سینکڑوں مسافروں اور ان کو رخصت کرنے والے دوست احباب اور عزیز و اقارب کا وہ ہجوم تھا، کہ ہوائی اڈے پر ریلوے سٹیشن کا گمان ہو رہا تھا۔ پہلے لندن اور پھر امریکہ پہنچ کر یہ گمان یقین میں بدل گیا، کیونکہ وہاں کے ہوائی اڈے واقعی ریلوے سٹیشنوں سے زیادہ مصروف اور مقبول ہیں۔ اُن کے مقابلے میں نئی دہلی کا ہوائی اڈہ بڈگام کا بس اڈہ معلوم ہوتا ہے۔

ائر انڈیا میں ہڑتال کی وجہ سے میں پان ایم سے سفر کر رہا تھا۔ اور ہمارا جہاز ساڑھے چار بجے چلنے والا تھا۔ میں کسٹم کے امتحان سے پاس ہو کر، سیکورٹی کا امتحان دے رہا تھا کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا احمد سعید اکبر آبادی نظر آئے۔ میں انہیں اور وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے، میں نے انہیں اپنے ارادوں سے باخبر کیا، اور اُنہوں نے مجھے اپنے عزائم سے آگاہ کیا ۔ معلوم ہوا کہ وہ روسی حکومت کی دعوت پر سمرقند جا رہے ہیں۔ جہاں حضرت

امام بخاری کی بارہ سو سالہ برسی منائی جارہی ہے۔ سمر قند سے کچھ دور خرتنگ کے مقام پر ان کا مزار ہے اور اس سال روسی حکومت بڑے اہتمام سے ان کا عرس منارہی ہے، ہندوستان سے مفتی صاحب اور مولانا اکبر آبادی کو مدعو کیا گیا تھا۔ امام بخاریؒ سے روسیوں کی یہ عقیدت اور دلچسپی، میرے لئے اب بھی باعثِ حیرت ہے۔

جمبو میں میرے سفر کا یہ دوسرا تجربہ تھا، اس سے پہلے اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ، جب میں پہلی بار ایک پارلیمانی وفد کے ساتھ امریکہ گیا تھا۔ اور آج دوسری بار اپنی وسعت اور قامت کے اعتبار سے اِسے ہوائی جہاز کی بجائے "آئر شپ" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس میں بیکوقت ساڑھے تین سو مسافر سما سکتے ہیں۔ اور اس کی ایک صف میں دس نشستیں ہوتی ہیں۔ یہ دنیا کا پہلا دو منزلہ جہاز ہے اور اس کی دوسری منزل پر ایک بار اور ایک لاؤنج ہوتا ہے جس سے صرف فسٹ کلاس کے مسافر ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ لیکن جہاز ابھی زمین پر ہی تھا۔ چند لمحوں بعد اعلان کیا گیا۔ کہ کل پرزوں کی خرابی کی وجہ سے روانگی میں ایک گھنٹے کی تاخیر ہوگی۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے، ہوائی جہاز فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ اور میں ہندوستان کی سرزمین کو خیر باد کہہ کر، پاکستان کی سرحدوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہمارا پہلا پڑاؤ کراچی تھا۔ یہاں جہاز ایک گھنٹے کے لئے رکا، لیکن مسافروں کو ہدایت کی گئی، کہ وہ جہاز میں ہی بیٹھے رہیں۔ کراچی میں میرے بہت سے عزیز اور دوست رہتے ہیں۔ اور ۱۹۶۹ء میں جب پہلی بار کراچی آیا تھا، تو امان اللہ

،غلام محمد لون، عبدالقیوم ، عبدالمنان اور بہت سے دوسرے ساتھیوں نے یہاں میرا پُر جوش خیر مقدم کیا تھا۔ میری چچازاد بہن کلثوم، چچازاد بھائی نثار جاوید اور میرے چچا ایم اے صابر بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ ان سب لوگوں سے ملے ہوئے برسوں ہو گئے اور اب میرے حافظے سے ان کی تصویریں مٹی جا رہی ہیں۔ آج میں ان کے بہت قریب آگیا تھا۔ ان کے شہر میں، لیکن ہماری محبت پر تاریخ نے پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے۔ چند میلوں کا فاصلہ کئی صدیوں کا فاصلہ معلوم ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر ہی کسی شناسا چہرے کی تلاش کرتا رہا۔ مگر بے سود، جہاز کی روانگی سے پہلے بہت سے انگریز امریکی اور کچھ پاکستانی سوار ہو گئے اور چند لمحوں بعد ہم پھر فضا میں تیرنے لگے۔ چار سوا چار گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم بیروت پہنچ گئے۔ جہاں صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہوائی اڈے پر ایک گھنٹہ قیام کے بعد ہم یہاں سے استنبول اور فرینک فرٹ ہوتے ہوئے لندن کے لئے روانہ ہوں گے۔ بیروت کا ہوائی اڈہ چار منزلہ ہے۔ اور ۱۹۷۱ء میں جب ہم یہاں اُترے تھے، تو ان دنوں ابھی اس پر کام ہو رہا تھا۔ دِلّی کے ہوائی اڈے کے مقابلے میں یہ خاصا جدید، نظر آتا ہے ۔لیکن فرینک فرٹ، لندن اور پیرس کے ہوائی اڈوں کے سامنے اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ یہاں Duty Free دکانیں بہت مشور ہیں۔ اس لئے تقریباً سبھی مسافر ان پر ٹوٹ پڑے اور یہیں پہلی بار مجھے اندازہ ہوا۔ کہ

۱۹۷۱ء کے مقابلے میں آج چیزوں کی قیمتیں دو سے تین گنا بڑھ گئی ہیں۔
ہوائی اڈے پر تمام سائن بورڈ عربی میں نظر آرہے تھے۔ اور مجھے پاسپورٹ کے لئے جواز سفر، کا لفظ بہت پسند آیا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دو گھنٹے گزر گئے اور جہاز کی روانگی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ تیسرے گھنٹے کے خاتمے پر یہ اعلان ہوا کہ جہاز کی Fuel Pipe خراب ہے۔ اور اس کی مرمت میں مزید چند گھنٹے صرف ہوں گے۔ پھر کچھ دیر بعد اطلاع دی گئی، کہ یہ پرزہ لندن سے منگوانا ہے۔ اس لئے جہاز ٹھیک گیارہ گھنٹوں بعد روانہ ہوگا۔ اس سے مسافروں میں بڑی بے چینی پھیل گئی، اور سب لوگ اپنی بدبختی پر افسوس کرنے لگے۔ ہوائی اڈے پر مسلسل گیارہ گھنٹوں کے انتظار کا تصور بھی میرے لئے تکلیف دہ تھا۔ لیکن چند لمحوں بعد یہ اعلان ہوا کہ لندن جانے والے مسافروں کے لئے ایک اور جہاز کا انتظام کیا جارہا ہے اور اڑھائی بجے تک زیادہ سے زیادہ مسافروں کو لندن بھیجا جائیگا۔ ہماری جان میں جان آئی اور اڑھائی بجے Gulf Air کے ایک خوبصورت کیروال جہاز میں سوار ہم لندن کے لئے روانہ ہوگئے۔ خوش قسمتی سے یہ فلائٹ براہ راست لندن جارہی تھی۔ اس لئے ہم استنبول اور فرینک فرٹ میں اُترنے کی زحمت سے بچ گئے۔ میرے ساتھ والی نشستوں پر کویت کا ایک پورا...... خاندان لندن جارہا تھا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں جب میں نے ان سے گفتگو شروع کی۔ تو وہ بہت محظوظ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ کویت کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ اور سیر وسیاحت کیلئے لندن جارہے ہیں۔ چھ گھنٹے کی

مسلسل پرواز کے بعد جب ہمارا جہاز لندن میں اُترا۔ تو میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ ائر ہوسٹس نے اعلان کیا۔ کہ لندن میں اس وقت شام کے چھ بج رہے ہیں۔ حالانکہ میرے حساب سے ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ ہوائی جہاز جب ایک جگہ پر آکر رُک گیا۔ تو میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کہ ایک بہت بڑی بس آہستہ آہستہ زمین سے اونچی ہوتی جارہی ہے اور چند لمحوں بعد یہ بس جہاز کے دروازے پر آکر رُک گئی۔ پھر بیکوقت جہاز اور بس کے دروازے کھل گئے۔ اور یہ بس جہاز ہی کا ایک حصہ معلوم ہونے لگی، اور مسافروں کو ہدایت ہوئی۔ کہ وہ اس میں منتقل ہو جائیں۔ جب بس مسافروں سے بھر گئی تو اس کے دوراز ے بند ہو گئے۔ اور یہ پھر رفتہ رفتہ نیچے آنے لگی۔ چند لمحوں پر Terminal بلڈنگ کی طرف دوڑ رہی تھی۔ لندن کا ہتھیر و Heathrow ائر پورٹ یوروپ کا مصروف ترین ہوائی اڈہ ہے۔ اور اس کی عمارت، کئی عمارات کی ایک فیڈریشن ہے۔ ایک انجان آدمی کے لئے یہ لکھنو کی بھول بھلیوں سے کم نہیں۔ لیکن قدم قدم پر مسافروں کی رہنمائی کے لئے اتنے واضح نشانات موجود ہیں، کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی کبھی اپنا راستہ نہیں کھو سکتا، پاسپورٹ کے معائنے اور کسٹم کی دیکھ بھال میں صرف چند لمحے صرف ہوئے اور میں ساڑھے چھ بجے کے قریب بس میں بیٹھ کر شہر کی جانب روانہ ہوا۔ یہ بس چوں کہ ساؤتھ ہال (جہاں اسی فیصد آبادی ہندوستانیوں کی ہے) سے گزر کے جاتی ہے، اس لئے یہ اپنے ہم وطنوں سے بھری پڑی تھی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نئی دہلی سے کشمیری گیسٹ

ہاؤس جا رہا ہوں۔ وہی جانے پہچانے چہرے، وہی پنجابی گل بات اور وہی رنگ برنگی ساڑھیاں، بس کے آخری کونے میں ایک بوڑھا انگریز، اپنے ہی وطن میں اجنبی دکھائی دے رہا تھا، لیکن اپنی سیٹ کے اوپر ایک اشتہار پڑھ کر، مجھے یک لخت یہ احساس ہوا کہ میں ہندوستان میں نہیں انگلستان میں ہوں۔ یہ اشتہار تھا ڈرئیوروں اور کنڈ یکٹروں کے لئے، اور اس میں ڈرئیواروں کیلئے ۴۲ پونڈ یعنی ۸۴۵ روپے فی ہفتہ اور کنڈ یکٹروں کے لئے ۳۵ پونڈ یعنی ۷۰۰ روپے) فی ہفتہ تنخواہ کی پیشکش کی گئی تھی اور ہفتہ بھی صرف پانچ دنوں کا، سنیچر وار اور اتوار کا کام کرنے کیلئے مزید اُجرت کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مسافروں سے یہ معذرت کی گئی تھی کہ ڈرائیوروں اور کنڈ یکٹروں کی کمی کی وجہ سے بسوں کی تعداد میں کمی ناگزیر ہوگئی ہے۔

ہمارے ہاں آٹھ سو چالیس ۸۴۰ روپے ماہانہ تنخواہ پانے والا، ڈپٹی سیکریٹری، انڈر سکریٹری اور نہ معلوم کیا کیا کہلاتا پھرتا ہے۔ اور یہاں کا ڈرائیور صرف ایک ہفتے میں ساڑھے آٹھ سو ۸۵۰ روپے کماتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک ڈرائیور کی ضرورت ہو، تو بارہ سو ڈرائیور درخواستیں لے کر دوڑتے ہیں۔ لیکن اس ملک میں ڈرائیوروں کو طرح طرح کے لالچ دیئے جاتے ہیں۔ کہ وہ کسی طرح کام کرنے پر راضی ہو جائیں اور اس کے باوجود اخبارات میں بڑھتی ہوئی بے کاری اور بیروزگاری کا چرچا ہوتا ہے۔ یا اللہ! یہ کس قسم کی بے کاری ہے کہ اس پر اپنے ہاں کا کاروبار، قربان کرنے کو جی چاہتا ہے!

لندن کی تین چیزیں ہر نو وارد کو سب سے پہلے متاثر کرتی ہیں۔ ایک

بی بی سی دوسری انڈر گراؤنڈ ریلوے اور تیسری یہاں کی پولیس، بی بی سی (برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن) اس ملک کا سب سے باوقار قابلِ اعتبار اور خود مختار ادارہ ہے۔ اور اسے بجا طور پر یہاں کی سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ بی بی سی کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام صرف تفریحی اعتبار سے ہی دلچسپ نہیں ہوتے، بلکہ ان کی تعلیمی اور تمدنی سطح بھی اتنی بلند ہوتی ہے کہ جو شخص باقاعدگی سے یہ پروگرام دیکھے اور سنے اُسے گھر بیٹھے بیٹھے دنیا بھر کے بارے میں اتنی بصیرت حاصل ہوسکتی ہے کہ جو ہماری یورنیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے والے بڑے بڑے سکالروں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ بی بی سی کی تین چینلوں کے علاوہ ایک انڈی پنڈنٹ ٹیلی ویژن (آئی، ٹی، وی) سٹیشن بھی ہے، بی بی سی کی خبروں اور تبصروں کے اعلیٰ معیار کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ امریکہ جیسے ملک میں بھی صحیح اور معتبر خبریں سُننے کے لئے لوگ بی بی سی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ارباب حکومت ہوں یا اہل سیاست، ملکہ برطانیہ ہو یا خود بی بی سی کا انتظامیہ، کوئی بھی موضوع بے رحمانہ تنقید اور بے لاگ تبصرے سے بالاتر نہیں۔ ایک شام بی بی سی ٹیلی ویژن نے اپنے ہی خلاف ایک بحث کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں دیکھنے والوں نے بی بی سی پر نا اہلیت، جانبداری اور لوگوں کے اخلاق خراب کرنے کے الزامات عائد کیئے۔ لندن میں اپنے تین ہفتوں کے قیام کے دوران مجھے ایکبار بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ بی بی سی نے بالواسطہ طور پر بھی برسر اقتدار لیبر پارٹی کی حمایت کی ہو یا اُس کی

طرف کسی قسم کی جانبداری ہوتی ہو، مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ انتخابات کی ساری گہما گہمی اور ہنگامہ آرائی کا مرکز بھی ٹیلی ویژن اور ریڈیو ہی ہے اور یکم اکتوبر سے ۱۰/۱ اکتوبر تک جبکہ وہاں پارلیمانی انتخابات کی مہم چل رہی تھی۔ مجھے صرف ٹیلی ویژن دیکھ کر ہی یہ اندازہ ہوا کہ اس ملک میں انتخابات ہورہے ہیں۔ اپنے ہاں انتخابات کے ساتھ جلسے، جلوس، اونٹ، ہاتھی، پوسٹر، پولیس، پتھراؤ، لاٹھی چارج، یہ سب کچھ وابستہ ہے۔ لیکن اگر لندن میں آپ شام کو ٹیلی ویژن نہ دیکھیں یا ریڈیو نہ سنیں تو آپ کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ اس ملک میں انتخابات ہورہے ہیں۔ کم از کم میرا تاثر یہی تھا۔ انتخابی جلسے اور میٹنگیں ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن پروپگنڈے اور بحث ومباحثے کا سب سے موثر ذریعہ ٹیلی ویژن ہے اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ انتخابات کی اصل معرکہ آرائی کا مرکز ٹیلی ویژن ہی ہے۔ اور ہار جیت کا فیصلہ بھی یہیں ہوتا ہے۔ ریڈیو سے انتخابات کے دوران خاص پروگرام براڈکاسٹ کیئے جاتے ہیں۔ ہر پارٹی کے لیڈر یا نمائندے کو مدعو کیا جاتا ہے اور پھر سننے والوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ انگلستان کے کسی بھی کونے سے ٹیلی فون پر (جو سٹوڈیو میں لگا ہوا ہوتا ہے) پارٹی کے لیڈر یا ترجمان سے سوالات پوچھیں اور اس کے بعد وہ ان کا جواب دیتا ہے۔ اسی طرح ایل بی سی کے نام کا ایک ریڈیو سٹیشن رات بھر چالو رہتا ہے اور آپ رات میں کسی بھی وقت ٹیلی فون کرکے اپنی کوئی ذاتی مشکل مسئلہ یا اُلجھن بیان کرکے، ان سے رائے پوچھتے ہیں ایک رات میں نے بہت سی دلچسپ گفتگو سُنی جس کا کچھ حصہ مجھے یاد ہے۔ ٹیلی

فون کرنے والا پوچھ رہا تھا۔ کہ میں شراب پینے کا عادی ہوں۔ آج مجھے شراب نہیں ملی ہے اور مجھے نیند نہیں آ رہی ہے مجھے بتایئے کہ میں کیا کروں؟ ریڈ سٹیشن سے جواب ملا کہ آپ کوئی کتاب پڑھنا شروع کر دیجئے۔ کچھ دیر بعد خود ہی نیند آ جائیگی۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ یہ نسخہ آزما چکا ہوں۔ لیکن کتاب میں ایک کردار بار بار شراب پیتا ہے اور اس سے میرے دل میں شراب کی طلب اور بڑھ گئی ہے۔ ریڈیو سٹیشن کی طرف سے جواب ملا۔ کہ آپ سیر کو جایئے کچھ دیر تک چلتے رہنے کے باعث آپ تھک جائیں گے تو پھر نیند آ جائیگی۔ سوال کرنے والے نے کہا یہ تو ممکن ہی نہیں کیونکہ باہر ہی ایک شراب خانہ ہے اور اسے دیکھ کر میری شراب کی پیاس بڑھ جائے گی۔ اس مرحلے پر ریڈیو سٹیشن سے جواب ملا کہ پھر جا کر شراب پی لیجئے۔ اور ہمارا بھیجا مت چاٹیے اس کے فوراً بعد ایک خاتون کا ٹیلی فون آیا۔ وہ شکایت کر رہی تھیں کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج رات میرے پاس آئیگا۔ وہ نہیں آیا اور مجھے اس کے انتظار میں نیند نہیں آ رہی ہے میں کیا کروں۔''

''آپ اس کے گھر ٹیلی فون کر کے پوچھ کیوں نہیں لیتیں، کہ وہ کیوں نہیں آیا؟'' ''ریڈیو سٹیشن'' سے جواب ملا۔ ''اس نے منع کیا ہے کہ میرے گھر ٹیلی فون نہ کرنا۔'' خاتون نے جواب دیا...... پھر وہ یقیناً کسی دوسرے دوست کے پاس گیا ہوگا۔ اور ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے''۔ ریڈیو سٹیشن نے جواب دیا۔

ان دنوں لندن میں پاکستان اور انگلستان کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان ٹیسٹ میچ کھیلا جارہا تھا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر قدرے تعجب ہوا کہ لندن شہر کے لوگ کرکٹ کے اتنے دیوانے نہیں ہیں کہ جتنا ہم ہندوستانی، میں نے ٹیلی ویژن پر یہ ضرور دیکھا کہ کھیل کا میدان لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن عام لوگوں پر دیوانگی کا وہ عالم طاری نہیں تھا جو کسی ٹیسٹ میچ کے دوران اپنے ہاں ہوتا ہے۔ اس میچ میں پاکستانی کھلاڑیوں نے اپنے کھیل کا بہترین مظاہرہ کیا اور برطانوی اخبارات نے دل کھول کر ان کی تعریف کی۔

باب دوئم

ماسکو کی انڈر گراونڈ سب سے خوبصورت پیرس کی سب سے آسان، نیو یارک کی سب سے گھٹیا اور لندن کی سب سے منظّم اور عمدہ ٹرانسپورٹ سروس ہے۔ نیو یارک میں زیادہ تر لوگ موٹریں استعمال کرتے ہیں لیکن لندن میں انڈر گراونڈ سفر کا سب سے آسان آرام دہ اور مقبول ذریعہ ہے۔ یہ زمین دوز ریلیں بہت آرام دہ ہیں۔ وقت کی سختی سے پابند اور کافی تیز رفتار ہوتی ہیں۔ اور انہیں روز مرہ کے استعمال میں ٹیوب کہا جاتا ہے۔ ہر ٹیوب سٹیشن پر زمین دوز ریلوے کا پورا نقشہ اور اس کے استعمال کی چابی، مفت ملتی ہے اور یہ نقشہ اس قدر آسان اور جامع ہے کہ اِسے ایک بار سمجھنے کے بعد ایک اجنبی بغیر کسی امداد یا رہنمائی کے پورے لندن کا سفر کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر بڑے سٹیشن پر ایک بورڈ لگا رہتا ہے کہ جس پر پوری انڈ گراونڈ کا نقشہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے نیچے ٹائپ مشین کی طرح حروف تہجی کی ترتیب سے تمام سٹیشنوں کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ آپ کو جس جگہ جانا ہو۔ وہ بٹن دبا دیجئے، نقشے پر فوراً اِن دو سٹیشنوں کے درمیان والا راستہ روشن ہو جائیگا اور آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ آپ کو کونسی لائن پر جانا ہے اور راستے

میں کون کون سے سٹیشن آئیں گے۔ فرض کیجئے کہ آپ کو آکسفورڈ مرکس سے بیرن کورٹ جانا ہے۔ آپ کو آکسورڈ مرکس سٹیشن پر لگے ہوئے سوئچ بورڈ میں بیرن کورٹ کا بٹن دبائیں گے تو آکسفورڈ مرکس. سے بیرون کورٹ کا سب سے مختصر راستہ بورڈ پر فوراً روشن ہو جائے گا۔ اور آپ اسی حساب سے ٹکٹ اور ٹرین کا فیصلہ کریں گے۔ ہر سٹیشن پر ٹکٹ کاؤنٹروں کے علاوہ ٹکٹ مشین لگی ہوتی ہیں۔ ان مشینوں پر یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس اسٹیشن سے باقی سٹیشنوں تک کتنے پنیس کا ٹکٹ لگے گا۔ آپ مشین میں اتنے پیسے ڈال دیجئے، کھٹ سے ٹکٹ نکل آئے گا۔ اور اگر آپ کے پاس اس رقم کی ریز گاری نہیں ہے، تو آپ ٹکٹ کاؤنٹر سے ٹکٹ لے سکتے ہیں۔ لیکن اس بات کا خیال رکھئے کہ یہاں آپ کو باقاعدہ لائن میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ مگر گھبرائیے نہیں، لمبی سے لمبی لائن ہی کیوں نہ ہو، آپ کو تین یا پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ٹکٹ کاؤنٹروں پر بھی مشین لگی ہوتی ہیں۔ آپ نے ایک پونڈ کا نوٹ دیا ہے اور آپ نے پنیس کا ٹکٹ مانگا ہے۔ صرف آپ کے پیسے دینے کی دیر ہے۔ ٹکٹ بیچنے والا بیک وقت دو بٹن دبائے گا۔ ایک سے ٹکٹ برآمد ہوگا اور دوسرے سے ریز گاری، اس طرح پورا عمل زیادہ سے زیادہ دس سکینڈ میں مکمل ہوگا۔

نیویارک میں انڈر گراونڈ سے سفر کا کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کرایہ ۳۵ سنٹ ہے۔ آپ کو دو فرلانگ جانا ہو یا دس میل آپ کو ۳۵ سنٹ کا ٹوکن (ٹکٹ) خریدنا پڑے گا۔ لندن میں انڈر گراونڈ کا ٹکٹ فاصلے کے مطابق

ہے۔ جتنا فاصلہ ہوگا، اسی حساب سے ٹکٹ بھی ہوگا۔ ٹکٹ خرید کر جیب میں نہیں ہاتھ میں رکھئے۔ اس سے دو کام لینا مقصود ہیں۔ سب سے پہلے انڈر گر وانڈ مشین میں داخل ہونے کا۔ اور دوسرا اسٹیشن سے باہر آنے کا۔ داخلے کے گیٹ پر کوئی ٹکٹ دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ کام گیٹ ہی سے لیا جاتا ہے۔ آپ اپنا ٹکٹ گیٹ میں لگے ہوئے ایک چھوٹے سے دہانے میں دبا دیجئے گیٹ کا دروازہ کھٹ سے کھل جائے گا۔ اور دروازہ کھلنے کے بالکل ساتھ ہی دوسرے دہانے سے ٹکٹ بھی باہر نکل آئے گا۔ یہ ٹکٹ سنبھال لیجئے اور آگے بڑھئے، ایک ٹکٹ ڈالنے سے صرف ایک انسان کیلئے گیٹ کھلے گا۔ اور جوں ہی آپ نے گیٹ کراس کرلیا۔ یہ فوراً بند ہوجائیگا۔ اب آگے Esclator ہے۔ Esclator بجلی سے چلنے والی ایک سیڑھی ہوتی ہے جو مسلسل اوپر اور نیچے چلتی رہتی ہے۔ اس پر بالکل ہمارے ہاں کی سیڑھی کی طرح پائے دان ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی سیڑھاں منجمد ہوتی ہیں اور ایکسلیٹر متحرک ہوتا ہے آپ ایک پائدان پر کھڑے ہوجائے اور بس یہ سیڑھی آپ کو خود اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر لے جائیگی۔ یہ سیڑھی اب آپ کو کئی سوفٹ زمین کے نیچے لے جائیگی اور بعض اوقات آپ کو ٹرین تک پہنچنے کے لئے ایسی دو سیڑھیوں سے نیچے اترنا پڑتا ہے جو لوگ بہت جلدی میں ہوں، وہ بجلی کی ان سیڑھوں کے ساتھ ساتھ خود بھی چلتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی رفتار دوگنی ہوجاتی ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ صرف پائے دان پر کھڑے ہوجاتے ہیں ایک جانب سے نیچے جانے والا

Esclatr چالو رہتا ہے۔ شروع شروع میں یہ منظر بہت دلچسپ اور حیران کن نظر آتا ہے اور میں نے بجلی کی ان سیڑھیوں سے اوپر آنے اور جانے میں بڑا وقت ضائع (صرف) کیا۔ پھر چند دنوں بعد بالکل نارمل بات معلوم ہوتی ہے۔ زمین کے نیچے ریلوے کا سلسلہ خاصا پیچیدہ ہے لیکن مسافروں کی رہنمائی کیلئے ہر قدم پر سائن بورڈ لگے ہوتے ہیں اور اگر آپ ذرا سی توجہ دے کران ہدایت پر عمل کریں، تو آپ کبھی غلطی کھا ہی نہیں سکتے۔ ہر پلیٹ فارم پر ایک بڑے بورڈ پر جلی حروف میں لکھا رہتا ہے کہ یہاں سے کس سمت میں ٹرین آئیگی اور کس کس اسٹیشن کو جائیگی۔ ٹرین رُک جانے کے فوراً بعد ڈبوں میں دروازے ایک ساتھ کھل جاتے ہیں اور اس کے بعد سوار ہونے والے، سوار ہو جاتے ہیں، دو منٹ کے وقفے کے بعد سب دروازے بند ہو جاتے ہیں اور ریل روانہ ہو جاتی ہے دروازے کھولنے اور بند کرنے کا کنٹرول ڈرائیور کے پاس ہوتا ہے اور جب تک ایک بھی دروازہ کھلا ہو، ٹرین آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ دیکھ کر اپنے ہاں کی وہ ریلیں یاد آئیں کہ جن کے دروزے کبھی بند نہیں ہوتے اور جن پر سینکڑوں مسافر لٹکتے رہتے ہیں۔ ایک اور قابل ذکر حقیت یہ ہے کہ ہر روز لاکھوں لوگوں کے استعمال کے باوجود یہ ریلیں اندر سے اتنی صاف اور شفاف ہیں کہ جیسے کل ہی فیکٹری سے برآمد ہوئی ہوں۔ مجال ہے کہ فرش پر کاغذ یا سگریٹ کا کوئی ٹکڑا نظر آئے۔ پلیٹ فارم پر ہزاروں کا مجمع ہی کیوں نہ ہو۔ کسی دھکم پیل یا دھینگا شتی کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ سب لوگ جانتے ہیں کہ اگر ایک ٹرین میں جگہ نہ ملی تو

پانچ منٹ کے اندر اندر دوسری ٹرین آنے والی ہے۔ صفائی کے اعتبار سے ٹیوب سٹیشن بھی قابل تعریف ہیں، عام طور پر ریلوں میں سفر کرنے والے لوگ ایک دوسرے سے باتیں نہیں کرتے، بلکہ اخبار پڑھتے رہتے ہیں اور اگر کسی کو بات کرنے کی ضرورت محسوس ہو، تو وہ بہت مدھم لہجے میں بات کرتا ہے، میرے دوست ڈاکٹر شنکر رینہ کو بات کرنے اور چلانے کا فرق معلوم نہیں۔ اس لئے جب وہ ٹرین میں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگتے، تو سارے مسافر ہماری طرف یوں دیکھتے کہ جیسے ہم ابھی ابھی کسی چڑیا گھر سے چھوٹ کر آئے ہیں۔

لندن کی پولیس، معیار، کردار، گفتار، ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے، وہ ہر مشکل میں آپ کی مددگار اور ہر مصیبت میں آپ کی غمخوار ثابت ہوگی، آپ راستہ بھول گئے ہوں۔ بیچ سڑک میں آپ کی گاڑی خراب ہوگئی ہو، آپ یا آپ کا کوئی ساتھی دفعتاً کہیں بیمار یا بے ہوش ہو گیا ہو، راہ چلتے چلتے آپ کا بچہ آپ سے بچھڑ گیا ہو، آپ سڑک پر کھڑے کسی پولیس والے سے کہہ دیجئے وہ نہ صرف آپ کی صحیح رہنمائی کرے گا بلکہ آپ کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ لندن میں کوئی پولیس والا "مجھے معلوم نہیں" کہہ کر آگے نہیں بڑھے گا۔ اُسے جب تک اِس بات کا اطمینان نہ ہو کہ آپ کی مشکل حل ہوگئی ہے۔ وہ آپ کو چھوڑ کر چلا نہیں جائیگا۔ وہاں کا پولیس آفیسر رعونت، تحکم اور تکبر کا پیکر نہیں، نرمی، حلیمی اور نکسار کا مجسمہ ہوتا ہے۔ بے حد فرض شناس اور چاق و چوبند پولیس فورس میں مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہیں۔ خاص طور پر

ٹریفک پولیس میں جرائم کی روک تھام اور مجرموں کا سراغ لگانے کیلئے لندن پولیس کی خصوصی تنظیم سکاٹ لینڈ یارو'' دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کرنے والوں کو فوری طور سزا دی جاتی ہے۔ اور وہ یوں کہ خلاف ورزی کرنے والے کی گاڑی پر ٹریفک پولیس کا سپاہی جرمانے کی ٹکٹ چپکا دیتا ہے جو اِسے بہر حال ادا کرنا پڑتا ہے۔ انگلینڈ اور امریکہ دونوں ممالک میں پارکنگ کا مسئلہ روز بروز پیچیدہ بنتا جا رہا ہے۔ خاص طور پر امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں ہر شہر میں سڑکوں پر پارکنگ میٹر لگے ہوئے ہیں اور آپ صرف اپنی گاڑی انہی میٹروں کے ساتھ کھڑی کر سکتے ہیں اور جتنی دیر آپ گاڑی کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ اِسی حساب سے آپ کو میٹر میں پیسے ڈالنا ہوں گے اور جوں ہی یہ وقت ختم ہوگیا۔ میٹر کی سوئی آپ کے خلاف شہادت دینا شروع کرے گی۔ اس دوران میں اگر پولیس کے کسی سپاہی نے میٹر کا معائینہ کر کے یہ دیکھا کہ آپنے میٹر میں پیسے ڈالے بغیر گاڑی کھڑی کر دی ہے یا کم وقت کیلئے پیسہ ڈال کر زیادہ وقت کے لئے گاڑی کھڑی رہا ہے۔ تو آپ کو جرمانے کی سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

لندن کی صفائی کا انتظام قابلِ تعریف بھی ہے اور قابل تقلید بھی سڑکوں پر سو سو گز کے فاصلے پر کوڑا کرکٹ ڈالنے کے لئے سیمنٹ کے بڑے بڑے ڈرم نصب ہیں اور چوں کہ سڑکوں پر کوڑا ڈالنے کی سزا سو پونڈ (تقریباً دو ہزار روپے) ہے۔ اس لئے ہر شخص ہی Dust Bin استعمال کرتا ہے۔

چونکہ ہر چیز کے لئے پلاسٹک یا کاغذ کے Containers کا رواج

ہے۔ ہر روز لاکھوں کی تعداد میں یہ Container پھینک دیئے جاتے ہیں اور اگر ان کو سڑکوں پر پھینک دیا جائے تو صرف دو دن کے اندر اندر ان پر آمدورفت مشکل بن جائیگی۔ لیکن ہر سٹور، سڑک، دکان اور ریستوران میں اس بات کا انتظام ہے کہ سارا کوڑا بڑے بڑے پلاسٹک تھیلوں میں جمع کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور علی الصبح میونسپلٹی کی گاڑی آ کر اُسے شہر سے باہر لے جاتی ہے۔ یہی حال گھروں کا بھی ہے۔ گھر والے سارا کوڑا کرکٹ ایک تھیلے میں بند کر کے اپنے دروازے کے باہر رکھ دیتے ہیں اور میونسپلٹی والے آ کر اِسے لے جاتے ہیں، لندن میں لوگوں کو اخبار پڑھنے کی سخت عادت ہے۔ اور تقریباً ہر شخص اخبار خرید کر پڑھتا ہے۔ اِس لئے ہر صبح اور ہر شام ردّی کے ڈھیر جمع ہو جاتے ہیں اور میں پیسے بچانے کی خاطر اکثر Dust Bins سے اخبار اُٹھا کر پڑھتا۔

باب سوئم

معلوم نہیں، مجھے لندن میں اجنبی ہونے کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔
۱۹۷۱ء میں جب یہ پہلی بار لندن گیا، تو جب بھی مجھے یہی محسوس ہوا کہ یہ شہر
کچھ جانا پہچانا ہے اور اس دفعہ تو ایسا لگ رہا تھا، کہ میں نئی دہلی میں گھوم رہا
ہوں، ایک تو اس لئے کہ ہر سڑک ہر بازار اور ہر موڑ پر ہندوستانی
(یا پاکستانی) نظر آتے ہیں ۔ دوئم انگریزی زبان اجنبیت کا احساس
نہیں ہونے دیتی۔ انگریزی کی معمولی شدھ بدھ رکھنے والا بڑی آسانی
کیساتھ نہ صرف لندن میں گھوم پھر سکتا ہے۔ بلکہ کاروبار بھی کر سکتا ہے۔ اور
آپ کو یہ سن کر غالباً تعجب ہوگا کہ ہندوستان سے باہر جتنے ہندوستانی
ریستوران لندن میں ہیں ۔ دنیا کے کسی اور شہر میں نہیں ہیں ۔ اسی طرح
اسپتالوں میں کام کرنے والے ڈاکٹر، لندن ٹرانسپورٹ سروس چلانے والے
ڈرائیور، ٹیلی فون، ایکسچینج میں کام کرنے والے آپریٹر، حتیٰ کہ لندن کے ہوائی
اڈے پر صفائی کرنے والے خاکروب، ان سب میں ہندوستانیوں کی تعداد
سب سے زیادہ ہے۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک شام ہائیڈ

پارک لنڈن میں ایک افریقی نوجوان، انگریزوں کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے کہہ رہا تھا کہ تم انگریز بدمعاش ہو۔تم نے یہ کہہ کر ہندوستان پر سو سال حکومت کی کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کا نظام چلانے کا سلیقہ نہیں، اب صورت حال بدل گئی ہے۔اب تم میں اپنے ملک کا نظام چلانے کی صلاحیت نہیں ہے۔اور اسی لئے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے تمہارے ملک کا اندرونی نظام سنبھال لیا ہے۔"

اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں انسان بور نہیں ہوتا، آپ صبح سے شام تک صرف گھومتے رہیئے تو آپ کا وقت یوں گذر جائے گا کہ آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ دُنیا بھر کے لوگ لندن کی سڑکیں، ناپنے کیلئے یہاں آتے ہیں، صبح سے شام تک بازاروں میں اتنی بھیڑ رہتی ہے کہ خدا کی پناہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس شہر کے لوگ خریداری Shopping کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں کرتے، شہر کے ہر حصے اور ہر بازار میں بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ہیں اور ہر سٹور ایک مکمل بازار ہے۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے ایک لائن میں چار چار پانچ پانچ سٹور ہیں۔ اور ہر سٹور میں بیکوقت ہزاروں لوگ خریداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دکانداری اور خریداری کا طریقہ ہمارے ہاں کے کاروبار سے قطعی مختلف ہے اور میری خواہش ہے کہ اپنے ہاں کے بڑے بڑے تاجر کم از کم ایکبار لندن جا کر تجارت کے کچھ گُر سیکھ آئیں۔ ہر سٹور میں ہر چیز کے لئے الگ الگ کاؤنٹر اور شعبے ہوتے ہیں اور ہر چیز پر دام

لکھے ہوئے ہیں ۔ جو چیز یا جتنی چیزیں آپ کو پسند ہوں، اُٹھا لیجئے، کاؤنٹر کے ایک کونے میں کھڑی سیل گرل کے سامنے یہ ساری چیزیں رکھ دیجئے، وہ Calculator پر آپ کا بل بنا کر آپ کا سارا سامان ایک پلاسٹک بیگ میں رکھ دیگی، بل ادا کیجئے اور چلتے بنیئے ۔ نہ کہیں مول تول ہے ۔ اور نہ کھینچا تانی، ایک ایک سٹور میں بیک وقت تقریباً ہزار آدمی Shopping کرتے رہتے ہیں لیکن مجال ہے کہ کسی کو کوئی شکایت ہو، ہر سٹور مال سے بھرا پڑا ہے اور قدم قدم پر ایسی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں کہ ہر چیز خریدنے کو دل چاہتا ہے ۔ اکثر نوواردوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے سٹوروں میں چپکے سے کوئی چیز اُٹھا کر جیب میں ڈال دی جائے ۔ تو کوئی دیکھنے والا نہیں ۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو کر پکڑے گئے ہیں ۔ پچھلے سال ہماری کرکٹ ٹیم کے ایک مشہور کھلاڑی مسٹر سدھیر نائک کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا ۔ دراصل ہر بڑے سٹور میں Close Circuit ٹیلی ویژن لگا ہوا ہوتا ہے ۔ جو ہر کاؤنٹر پر نگاہ رکھتا ہے اور جس کے پردے پر ہر چیز صاف نظر آتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود چوریاں ہوتی رہتی ہیں ۔ کچھ لوگ پکڑے جاتے ہیں اور کچھ بچ نکلتے ہیں ۔ بات دراصل یہ ہے کہ اِن سٹوروں میں چوری کرنے کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے، کہ اس پر غالب آنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ ان سٹوروں میں گھومتے پھرتے کئی بار میرے دل میں بھی چوری کی شدید خواہش پیدا ہوئی (اتنی ساری چیزیں اور پھر اتنی عمدہ کوالٹی دیکھ کر کس کا جی نہیں للچائے گا) اور میں نے خوف

خدا کی وجہ سے نہیں، خوفِ ٹیلی ویژن کی بناء پر چوری کا ارتکاب نہیں کیا۔ ورنہ میں نے اپنے دل میں اس گناہ کے لئے بڑے معقول عذر تراشے تھے۔ مثلاً یہ کہ اکثر ڈیپارٹمنٹ سٹور یہودیوں کی ملکیت ہیں اور یہودیوں سے انتقام لینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے مال پر ہاتھ صاف کرو یا یہ کہ اس سٹور میں روز لاکھوں کا مال بکتا ہے میرے دو چار پونڈ کی چیزیں لے جانے سے کیا فرق پڑے گا۔ یا یہ کہ یہ انگریز بڑے بدمعاش ہیں۔ یہ سو سال تک ہمارے ملک کو لوٹتے رہے۔ آج میں ارباب وطن کی بیکسی کا انتقام لینے کے لئے کچھ چیزیں چرا لوں تو اس میں کیا بُرائی ہے۔ ان ساری دلیلوں پر ٹیلی ویژن سرکٹ کا خوف اس درجہ غالب آ گیا کہ میں نے اپنی خواہش کا گلا دیا کہ اپنے ایمان کی دولت کو بچالیا۔ بڑے بڑے سٹوروں میں چوری کے زیادہ تر واقعات میں غیر ملکی سیاح ملوث اور ماخوذ ہوتے ہیں اور آپ کو تعجب ہوگا کہ ان میں سے اکثر چور کافی دولت مند اور باثروت ہوتے ہیں۔ میرے لندن میں قیام کے دوران دو ایرانی خواتین کو چار چار چھ چھ پونڈ کی چیزیں چرانے کے الزام میں دھر لیا گیا۔ اور جب ان کی تلاشی ہوئی۔ تو ان کی جیبوں سے سو سو پونڈ برآمد ہوئے۔ اسی طرح اپنے سدھیر نائک نے بھی اس وقت دو ڈھائی پونڈ کے موزے چرا لئے جبکہ اُس کی جیب میں بیس بائیس پونڈ موجود تھے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنی اور آپ کی عزت بچانے میں کامیاب ہو گیا!

لندن وارد ہونے کے دوسرے دن مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بھی

مہنگائی کی وجہ سے ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، ہر جگہ افراطِ زر Inflation اور گراں بازاری کا موضوع زیر بحث تھا، جس سے بھی ملاقات ہوئی، وہ یہی رونا روتا، کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں نے مار ڈالا۔ خود میں نے یہ محسوس کیا کہ پچھلے چار سالوں میں بعض چیزوں کی قیمتوں میں ساٹھ سے اسی فیصد اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً جو قمیض میں نے ۱۹۷۱ء میں دو پونڈ میں خریدی تھی۔ وہ اس سال ساڑھے تین سے چار پونڈ میں بک رہی تھی۔ بچوں کے جو کپڑے چار سال پہلے ایک ڈیڑھ پونڈ میں ملے تھے۔ انکی قیمت اب کی بار تین اور چار پونڈ کے درمیان تھی۔ ان دنوں پچاس پیسوں میں پیٹ بھر کر کھانا کھایا جا سکتا تھا، آج پیٹ بھرنے کے لئے جیب میں کم سے کم ستر اسی پیسے ہونا ضروری ہیں۔ چمڑے کی بنی ہوئی چیزیں حد درجہ مہنگی ہیں۔ ایک عمدہ جوتا بیس سے بائیس پونڈ (تقریباً ۴۰۰ سو روپے) اور ایک اوسط درجے کا لیڈیز پرس ۷ اور ۸ پونڈ (تقریباً ڈیڑھ سو روپے) میں ملتا ہے۔ اس گراں بازاری اور افراطِ رز کے باوجود نہ چیزوں کی کمی ہے اور نہ خریداروں کی، ہر دکان بھری پڑی ہے اور ہر جگہ خریدنے والوں کا ہجوم ہے۔ خریداروں کو خریدنے کی ترغیب دینے کیلئے نت نئے اور دلچسپ طریقے استعمال کئے جاتے ہیں اور عام آدمی کی نفسیات کو سمجھ کہ اس سے بخوبی فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ مثلاً اکثر دکانوں پر Sale اور Grand Sale کے اشتہارات یا ماٹوز لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ جن میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ تمام چیزوں کی قیمتوں میں ۲۰ فیصدی کمی کی جارہی ہے۔ اب آپ دکان

کے اندر داخل ہو جائے تو داخل ہوتے ہی یہ لکھا ہوا نظر آئے گا کہ پہلے اس چیز کی قیمت ۷ پونڈ تھی، اس کے بعد ۷ پر نشان لگا کر نیچے لکھا ہوگا۔ کہ اب اس کی قیمت چار پونڈ اور ننانوے پیسے ہے۔ اسی طرح ہر چیز کی اصل قیمت اور ''موجود قیمت'' نمایاں کر کے خریدار کو ورغلایا جاتا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر دکانوں میں یہ سیل، سال بھر چلتی رہتی ہے چیزوں کی قیمتیں پانچ یا چھ پونڈ نہیں، ۴ پونڈ اور ۹۵ پیسے یا پانچ پونڈ ننانوے پیسے مقرر کی جاتی ہے۔ اس سے خریدار پر یہ نفسیاتی اثر پڑتا ہے کہ یہ چیز چار پونڈ میں بک رہی ہے۔ حالانکہ وہ بالآخر پانچ پونڈ سے کچھ زیادہ ہی رقم ادا کرتا ہے، انگلستان کے ہر شہر اور قصبے میں بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹوروں کی شاخیں ہیں اور خود لندن شہر کے ہر حصے میں ان سٹوروں کی کئی کئی شاخیں نظر آئیں گی۔ مارکس اینڈ سپنسر' سی اینڈ اے' سب سے بڑے اور مقبول سٹوروں کے نام ہیں۔ اور شہر کے جس حصے میں بھی جائیے۔ ہر جگہ یہ سٹور نظر آئیں گے۔

گھومنے پھرنے اور خریداری کے سب سے فیشن ایبل علاقے آکسفورڈ سرکس، آکسفورڈ سٹریٹ ہائڈ سٹریٹ، ریجنٹ سٹریٹ، پکاڈلی سرکس ماربل آرچ اور ٹریفا گر سکواٹر ہیں، شام کو پکاڈلی سرکس میں سب سے زیادہ ہجوم اور رونق ہوتی ہے اور رات کے بارہ ایک بجے تک یہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ گھومتے رہتے ہیں۔ یہاں کئی دکانیں ایسی ہیں۔ کہ جو چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہیں اور اس کے علاوہ اس ایریا میں بہت سے سینما اور تھیٹر ملیں گے ۔ یہیں میں نے پہلی مرتبہ Sex shops دیکھے اور ان دکانوں میں کیا کچھ

بکتا ہے۔ میں بیان کرنے سے معذور ہوں۔ اور ستم یہ ہے کہ یہ دکانیں ہفتے کے سات دن اور دن کے چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہیں اور یہاں کام کرنے والی زیادہ تر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان دکانوں میں ہر وقت ایک ہجوم عاشقاں نظر آتا ہے۔ پکاڈلی سرکس کے علاقے میں ہی وہ سنیما بھی بکثرت موجود ہیں۔ کہ جہاں انتہائی ہیجان انگیز، مخرب اخلاق اور بے حد عریاں فلمیں، جنہیں اصطلاح عام میں، بلیو فلمز کہا جاتا ہے۔ دکھائی جاتی ہیں اور اس کے علاوہ بے شمار Strip-Tease تھیٹر بھی یہیں پائے جاتے ہیں۔ جہاں درجن بھر نوجوان لڑکیاں اپنی عریانی کا مظاہرہ کر کے تھیٹر کے مالکوں کیلئے دولت اور اپنے لئے دو وقت کی روٹی کما لیتی ہیں۔ عورت کے جسم کی تجارت کے ان مرکزوں پر عورت کے جسم اور جنس کے تصوّر سے بھی نفرت ہونے لگتی ہے۔ یہیں مجھے پہلی بار، اپنی تہذیب اور اپنے ''فرسودہ'' اخلاقی تصورات کی خوبیوں کا احساس اور اندازہ ہوا۔ اور میں سوچنے لگا کہ زندگی کے ان شعبوں میں ہماری پسماندگی اس ''ترقی'' کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ اور قابل احترام ہے، میں کوئی قدامت پسند ملا نہیں ہوں، اور میں عورتوں کو سات پردوں میں چھپا کر رکھنے کے بھی خلاف ہوں۔ لیکن مغرب نے جس طرح عورت کی نسوانیت اور اس کے جسم کو سر بازار نیلام کر کے اپنی عشرت اور جذباتی تسکین کا سامان بہم کر لیا ہے وہ میرے لئے ناقابل برداشت اور قابلِ نفریں ہے۔ اس دنیا میں عورت کی اپنی کوئی شخصیت نہیں، وہ صرف مرد کے عیش کیلئے بنی ہے اور میرے ''قدامت پسند'' ذہن کو یہ ''جدیدیت''

منظور نہیں۔

پکاڈلی سرکس'' کا اندرونی علاقہ ایس بی ایچ او کہلاتا ہے۔ پہلے اس علاقے کو 'بازار حسن' بھی کہتے تھے لیکن اب چونکہ قانوناً جسم فروشی ممنوع قرار پائی ہے۔ اس لئے اس کاروبار کے انداز بدل گئے ہیں۔ اب جسم فروش عورتوں نے اپنے آپ کو ''ماڈل'' کا باعزت نام دیا ہے اور ماڈلنگ چونکہ جسم فروشی کی تعریف میں نہیں آتی، اس لئے اس عنوان کے تحت وہ اپنا شغل جاری رکھے ہوئے ہیں اس کے علاوہ Essort ایجنسیوں کے باقاعدہ دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ اور یہ دفتر ہمارے ہاں کے بڑے بڑے سیکریٹریوں، بلکہ منسٹروں کے دفتروں سے زیادہ باوقار طریقے پر سجے ہوئے ہیں۔ ان ایجنسیوں کا کام خریداروں کو ساتھی یا ہم سفر مہیا کرنا ہے اور اس خدمت کے عوض وہ ان سے باقاعدہ فیس وصول کرتے ہیں۔ الغرض عورت کی تجارت یہاں ایک باقاعدہ اور منظّم کاروبار ہے۔

بیرونی افسروں کا سیلاب

جموں اور کشمیر کے لوگ علاقائی امتیاز، سیاسی نا برابری اور سرکاری ملازمتوں میں ایک دوسرے کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرنے میں اس درجہ "مصروف" ہیں کہ انہیں اس حقیقت کا احساس ہی نہیں ہے کہ اس ریاست پر نہ جموں کے لوگ حکومت کر رہے ہیں اور نہ کشمیر کے، بلکہ بیرون ریاست سے درآمد کئے گئے وہ افسر، جنکی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جموں کے لوگ اس بات پر برہم ہیں کہ کشمیر کے مقابلے میں ان کے انڈر سیکریٹری کی تعداد کم ہے، اور کشمیری اس بات سے ناخوش کہ کابینہ میں جموی وزیروں کی تعداد کشمیری وزیروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، لیکن کسی کو یہ سوچنے کی فرصت نہیں کہ اختیار و اقتدار کا اصلی مالک کون ہے؟ اس اخبار نے آج سے دو سال قبل "افسروں کی درآمد" کے عنوان سے ایک اداریہ میں، ملک کے دوسرے حصوں سے لائے جانے والے افسروں کی تعداد میں پریشان کن اضافے کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے حکومت کو متنبہ کیا تھا، کہ اس قسم کا رجحان مقامی لوگوں کیلئے بے حد حوصلہ شکن اور غیر صحت مند ثابت ہو سکتا ہے، لیکن یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور پچھلے دو

اڑھائی سال کے دوران اجنبی افسروں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ قابل افسوس بات یہ ہے کہ بہت سے کلیدی منصبوں کے علاوہ معمولی جگہوں کو پُر کرنے کیلئے بھی ملک کے دوسرے حصوں سے افسر درآمد کئے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ چیف سیکریٹری سے لیکر سپرانٹنڈنٹ پولیس تک کے عہدے پر غیر ریاستی افسر تعینات ہیں۔ ہم ذاتی طور پر افسروں کی درآمد کے خلاف نہیں، لیکن ان افسروں کی درآمد اور انتخاب میں کوئی جواز، کوئی منطق اور کوئی اصول کارفرما ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر کسی مخصوص کام کیلئے کسی خاص اہلیت کا ہونا ضروری ہے اور ریاست میں کوئی شخص اس اہلیت کا دستیاب نہیں، تو ایسے مواقع پر نگاہ انتخاب کو ''مقامی'' تک محدود رکھنا یقیناً ناانصافی ہوگی، لیکن جب ریاست میں ایسے لوگ موجود ہوں، کہ جو نہ صرف اہلیت رکھتے ہوں، بلکہ غیروں کے مقابلے میں زیادہ مفید اور بہتر ثابت ہوسکتے ہوں۔ تو حالات میں غیروں کو ترجیح دینا شدید احساس کمتری اور بے غیرتی کی نشانی ہے۔ بدقسمتی سے ریاست پر حکومت کرنے والے غیر ریاستی افسروں کی ایک بہت بڑی تعداد ارباب اقتدار کی نااہلیت اور ناعاقبت اندیشی کے علاوہ ان کے احساسِ کمتری اور ان کی غلامانہ ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ بیرونی افسروں کی اس طویل فہرست میں بہت سے ایسے افسر نظر آئیں گے کہ جو دوسری ریاستوں میں نااہل اور ناکارہ ثابت ہوکر اب ہمارے سروں پر سوار کردیئے گئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں، کہ جن کی قابلیت، اہلیت ور تجربے میں کوئی شک نہیں، لیکن ریاستی افسروں میں بھی بہت سے افسر

آسانی کے ساتھ ان لوازِمات کو پورا کرتے ہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ ان افسروں کے ہوتے ہوئے اِس ''غیر پرستی'' کا کیا جواز ہے، ہم ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہیں گے، کہ ہمیں بیرونِ ریاست کے افسروں سے کوئی پرخاش نہیں، ہم صرف ایک اصول طے کرنے پر زور دے رہے ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِن افسروں کی درآمد میں ہماری ریاست کسی اصول کی بجائے ذاتی پسند اور ناپسند کو معیار بنائے بیٹھی ہے۔ کلیدی منصبوں پر فائز غیر ریاستی افسروں کی ایک فہرست پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا، کہ چیف سکریٹری، ایڈیشنل چیف سکریٹری، پلاننگ کمشنر، ایگری کلچر پروڈکشن کمشنر، ڈائریکٹر ایگری کلچر، ڈائریکٹر انڈسٹریز، ڈائریکٹر مائننگ اینڈ جیالوجی، ڈائریکٹر منرلز کارپوریشن، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈی آئی جی بورڈر، ڈی آئی جی جیل خانہ جات، ڈائریکٹر باغات، ڈائریکٹر اینمل ہسبنڈری اور چیف انجینئر فلڈ کنٹرول، سب لوگ ملک کے دوسرے حصوں سے درآمد کئے گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مہمان افسروں کو اونچی اونچی تنخواہوں کے علاوہ بہت سی ایسی سہولیات بھی بہم ہیں کہ جو کسی دوسری ریاست میں کسی افسر کو حاصل نہیں ہیں۔ قطع نظر اِس بات کے یہ مہمان نوازی خزانۂ عامرہ پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ ریاستی افسروں کی ترقی کے امکانات محدود ہوجاتے ہیں۔ انہیں تجربہ حاصل کرنے اور حاصل کئے گئے تجربے کو استعمال کرنے کا موقعہ نہیں ملتا اور اس طرح ان میں ایک احساسِ شکست خوردگی، بے اطمینانی اور بے

اڑھائی سال کے دوران اجنبی افسروں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ قابل افسوس بات یہ ہے کہ بہت سے کلیدی منصبوں کے علاوہ معمولی جگہوں کو پُر کرنے کیلئے بھی ملک کے دوسرے حصوں سے افسر درآمد کئے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ چیف سیکریٹری سے لیکر سپرانٹنڈنٹ پولیس تک کے عہدے پر غیر ریاستی افسر تعینات ہیں۔ ہم ذاتی طور پر افسروں کی درآمد کے خلاف نہیں، لیکن ان افسروں کی درآمد اور انتخاب میں کوئی جواز، کوئی منطق اور کوئی اصول کارفرما ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر کسی مخصوص کام کیلئے کسی خاص اہلیت کا ہونا ضروری ہے اور ریاست میں کوئی شخص اس اہلیت کا دستیاب نہیں، تو ایسے مواقع پر نگاہ انتخاب کو ''مقامی'' تک محدود رکھنا یقیناً ناانصافی ہوگی، لیکن جب ریاست میں ایسے لوگ موجود ہوں، کہ جو نہ صرف اہلیت رکھتے ہوں، بلکہ غیروں کے مقابلے میں زیادہ مفید اور بہتر ثابت ہوسکتے ہوں۔ تو حالات میں غیروں کو ترجیح دینا شدید احساس کمتری اور بے غیرتی کی نشانی ہے۔ بدقسمتی سے ریاست پر حکومت کرنے والے غیر ریاستی افسروں کی ایک بہت بڑی تعداد ارباب اقتدار کی نااہلیت اور ناعاقبت اندیشی کے علاوہ ان کے احساسِ کمتری اور ان کی غلامانہ ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ بیرونی افسروں کی اس طویل فہرست میں بہت سے ایسے افسر نظر آئیں گے کہ جو دوسری ریاستوں میں نااہل اور ناکارہ ثابت ہوکر اب ہمارے سروں پر سوار کردیئے گئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں، کہ جن کی قابلیت، اہلیت ور تجربے میں کوئی شک نہیں، لیکن ریاستی افسروں میں بھی بہت سے افسر

آسانی کے ساتھ ان لوازِمات کو پورا کرتے ہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ ان افسروں کے ہوتے ہوئے اِس 'غیر پرستی'' کا کیا جواز ہے، ہم ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہیں گے، کہ ہمیں بیرونِ ریاست کے افسروں سے کوئی پرخاش نہیں، ہم صرف ایک اصول طے کرنے پر زور دے رہے ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اِن افسروں کی درآمد میں ہماری ریاست کسی اصول کی بجائے ذاتی پسند اور ناپسند کو معیار بنائے بیٹھی ہے۔ کلیدی منصبوں پر فائز غیر ریاستی افسروں کی ایک فہرست پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا، کہ چیف سکریٹری، ایڈیشنل چیف سکریٹری، پلاننگ کمشنر، ایگری کلچر پروڈکشن کمشنر، ڈائریکٹر ایگری کلچر، ڈائریکٹر انڈسٹریز، ڈائریکٹر مائننگ اینڈ جیالوجی، ڈائریکٹر منرلز کارپوریشن، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈی آئی جی بورڈر، ڈی آئی جی جیل خانہ جات، ڈائریکٹر باغات، ڈائریکٹر اینمل ہسبنڈری اور چیف انجینئر فلڈ کنٹرول، سب لوگ ملک کے دوسرے حصوں سے درآمد کئے گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مہمان افسروں کو اونچی اونچی تنخواہوں کے علاوہ بہت سی ایسی سہولیات بھی بہم ہیں کہ جو کسی دوسری ریاست میں کسی افسر کو حاصل نہیں ہیں۔ قطع نظر اِس بات کے یہ مہمان نوازی خزانۂ عامرہ پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ ریاستی افسروں کی ترقی کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔ انہیں تجربہ حاصل کرنے اور حاصل کئے گئے تجربے کو استعمال کرنے کا موقعہ نہیں ملتا اور اس طرح ان میں ایک احساسِ شکست خوردگی، بے اطمینانی اور بے

اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اپنے ہاں کے افسروں کو عام لوگوں کے مزاج ان کی نفسیات، ان کے مخصوص مسائل اور ماحول کو سمجھنے کیلئے جو مواقع میسر ہیں وہ مہمان افسروں کو حاصل نہیں اور اس طرح عوام اور بیرونی افسروں کے درمیان مغائرت، اجنبی پن اور تکلف کی ایک ایسی خلیج حائل رہتی ہے، جو بہت سی انتظامی پیچیدگیوں کو جنم دیتی ہے۔ مقامی لوگ بیرونی افسر کو غیر سمجھ کر اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ بیرونی افسر یہاں کے لوگوں کی زبان، ان کے مزاج اور ان کے مسائل کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس لئے وہ ان سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح باہمی تشکیک، بے اعتمادی اور اجنبی پن، بیزاری کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ اور بیرونی افسر اور مقامی لوگوں کے درمیان ایک سرد جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ تلنگانہ میں حالیہ اتھل پتھل اور علیحدگی کا شدید مطالبہ اسی سرد جنگ کا گرم اظہار ہے اور جو لوگ کشمیر میں علیحدگی پسند تحریک کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ سے خائف ہیں انہیں تلنگانہ کے پس منظر میں اس تحریک کا جائزہ لینا چاہیئے۔ تلنگانہ کے لوگ زبان، معاشرت اور ماحول کے اعتبار سے آندھرا کا ایک جز ہیں، لیکن اِس کے باوجود آندھرا کے غلبے کے خلاف منظّم ہو کر ایک ایسی بغاوت پر اُتر آئے ہیں کہ آج نہیں تو کل مرکزی سرکار کو ان کے مطالبات پورے کرنے ہی ہوں گے۔

خوش قسمتی یا بد قسمتی سے کشمیر میں علیحدگی پسند تحریک ایک خالص سیاسی نعرے اور جذباتی بے چینی کی نمائندگی کرتی ہے، اور اس بے چینی کو ابھی تک

اقتصادی اور معاشرتی مواد حاصل نہیں ہوا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ ریاست کے ایڈمنسٹریشن میں مرکزی مداخلت اور بیرونی افسروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے خلاف کسی منظّم ردِعمل کا احساس نہیں ہوتا، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حد آن پہنچی ہے اور جائز طور پر ریاستی عوام اور ریاستی افسروں میں یہ احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ مرکز اور ریاستی حکومت کے درمیان کوئی ایسا معاہدہ طے پایا ہے جس کی رُو سے اس ریاست پر اتنے غیر ریاستی افسر مسلط کر دیئے جائیں گے کہ مقامی افسروں کو اپنی کارکردگی، اہلیت اور موزونیت دکھانے کا کوئی موقعہ نصیب ہی نہ ہو۔ بیرون ریاست سے افسروں کی اس بہت بڑی تعداد کو درآمد کرنے کا ایک جواز یہ ہو سکتا تھا کہ ان کی خدمات سے فائدہ اُٹھا کر ریاست کے نظم و نسق میں کوئی ایسی بہتری ہوئی ہے کہ جو ان کے بغیر ممکن نہ تھی۔ لیکن عام تاثر یہ ہے کہ ایڈمنسٹریشن کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے اور کارکردگی کے اعتبار سے پورے ایڈمنسٹریٹو نظام پر ایک ایسا جمود چھایا ہوا ہے کہ اس میں اب زندگی کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے اکثر افسروں کا عام لوگوں کے ساتھ رویہ اس درجہ حقارت آمیز اور تحکمانہ ہوتا ہے۔ کہ جیسے وہ سرکاری افسر نہ ہوں، مطلق العنان بادشاہ ہوں۔ ریاست کے موجودہ چیف سیکریٹری مسٹر داوے کے متعلق یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ مقامی افسروں کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ قائم رکھنے میں اپنی توہین اور تحقیر سمجھتے ہیں اور جو بات مسٹر داوے کے بارے میں صحیح ہے وہ اکثر و بیشتر دوسرے مہمان افسروں پر

اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اپنے ہاں کے افسروں کو عام لوگوں کے مزاج ان کی نفسیات، ان کے مخصوص مسائل اور ماحول کو سمجھنے کیلئے جو مواقع میسر ہیں وہ مہمان افسروں کو حاصل نہیں اور اس طرح عوام اور بیرونی افسروں کے درمیان مغائرت، اجنبی پن اور تکلف کی ایک ایسی خلیج حائل رہتی ہے، جو بہت سی انتظامی پیچیدگیوں کو جنم دیتی ہے۔ مقامی لوگ بیرونی افسر کو غیر سمجھ کر اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ بیرونی افسر یہاں کے لوگوں کی زبان، ان کے مزاج اور ان کے مسائل کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس لئے وہ ان سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح باہمی تشکیک، بے اعتمادی اور اجنبی پن، بیزاری کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ اور بیرونی افسر اور مقامی لوگوں کے درمیان ایک سرد جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ تلنگانہ میں حالیہ اتھل پتھل اور علیحدگی کا شدید مطالبہ اسی سرد جنگ کا گرم اظہار ہے اور جو لوگ کشمیر میں علیحدگی پسند تحریک کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ سے خائف ہیں انہیں تلنگانہ کے پس منظر میں اس تحریک کا جائزہ لینا چاہیئے۔ تلنگانہ کے لوگ زبان، معاشرت اور ماحول کے اعتبار سے آندھیرا کا ایک جز ہیں، لیکن اِس کے باوجود آندھرا کے غلبے کے خلاف منظّم ہو کر ایک ایسی بغاوت پر اُتر آئے ہیں کہ آج نہیں تو کل مرکزی سرکار کو ان کے مطالبات پورے کرنے ہی ہوں گے۔

خوش قسمتی یا بدقسمتی سے کشمیر میں علیحدگی پسند تحریک ایک خالص سیاسی نعرے اور جذباتی بے چینی کی نمائندگی کرتی ہے، اور اس بے چینی کو ابھی تک

اقتصادی اور معاشرتی مواد حاصل نہیں ہوا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ ریاست
کے ایڈمنسٹریشن میں مرکزی مداخلت اور بیرونی افسروں کی بڑھتی ہوئی تعداد
کے خلاف کسی منظّم ردِعمل کا احساس نہیں ہوتا، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی
ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حد آن پہنچی ہے اور جائز طور پر ریاستی عوام اور ریاستی
افسروں میں یہ احساس پیدا ہوتا جارہا ہے کہ مرکز اور ریاستی حکومت کے
درمیان کوئی ایسا معاہدہ طے پایا ہے جس کی رُو سے اس ریاست پر اتنے غیر
ریاستی افسر مسلط کر دیئے جائیں گے کہ مقامی افسروں کو اپنی کارکردگی،
اہلیت اور موزونیت دکھانے کا کوئی موقعہ نصیب ہی نہ ہو۔ بیرون ریاست
سے افسروں کی اس بہت بڑی تعداد کو درآمد کرنے کا ایک جواز یہ ہوسکتا تھا
کہ ان کی خدمات سے فائدہ اُٹھا کر ریاست کے نظم ونسق میں کوئی ایسی
بہتری ہوئی ہے کہ جو ان کے بغیر ممکن نہ تھی۔ لیکن عام تاثر یہ ہے کہ ایڈ
منسٹریشن کا معیار روز بروز گرتا جارہا ہے اور کارکردگی کے اعتبار سے پورے
ایڈمنسٹریٹو نظام پر ایک ایسا جمود چھایا ہوا ہے کہ اس میں اب زندگی کے آثار
بھی نظر نہیں آتے۔ ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے اکثر افسروں
کا عام لوگوں کے ساتھ رویہ اس درجہ حقارت آمیز اور تحکمانہ ہوتا ہے۔ کہ
جیسے وہ سرکاری افسر نہ ہوں، مطلق العنان بادشاہ ہوں۔ ریاست کے موجودہ
چیف سیکریٹری مسٹر داوے کے متعلق یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ مقامی افسروں
کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ قائم رکھنے میں اپنی توہین اور تحقیر سمجھتے ہیں اور جو بات
مسٹر داوے کے بارے میں صحیح ہے وہ اکثر و بیشتر دوسرے مہمان افسروں پر

بھی صادق آئی ہے ۔ ہمیں نہ داوے صاحب سے کوئی شکوہ ہے اور نہ دوسرے دوستوں سے، شکوہ ہے تو اس نکمی سرکار سے کہ جو غیروں پر اس قدر مہربان ہے کہ اسے اپنوں کی کوئی خوبی ہی نظر نہیں آتی اور جسے صرف باہر سے لائے گئے سرکاری افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے میں اپنی نجات نظر آتا ہے۔

افسوس صرف اس بات کا ہے کہ جموں اور کشمیر کے عوام فرضی نابرابری اور علاقائی امتیاز کے نعروں کی گونج میں اصل حقیقت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو پاتے ۔ انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ

گرفتہ چیناں احرام مکمل خفتہ در بطحا

AINA NUMA
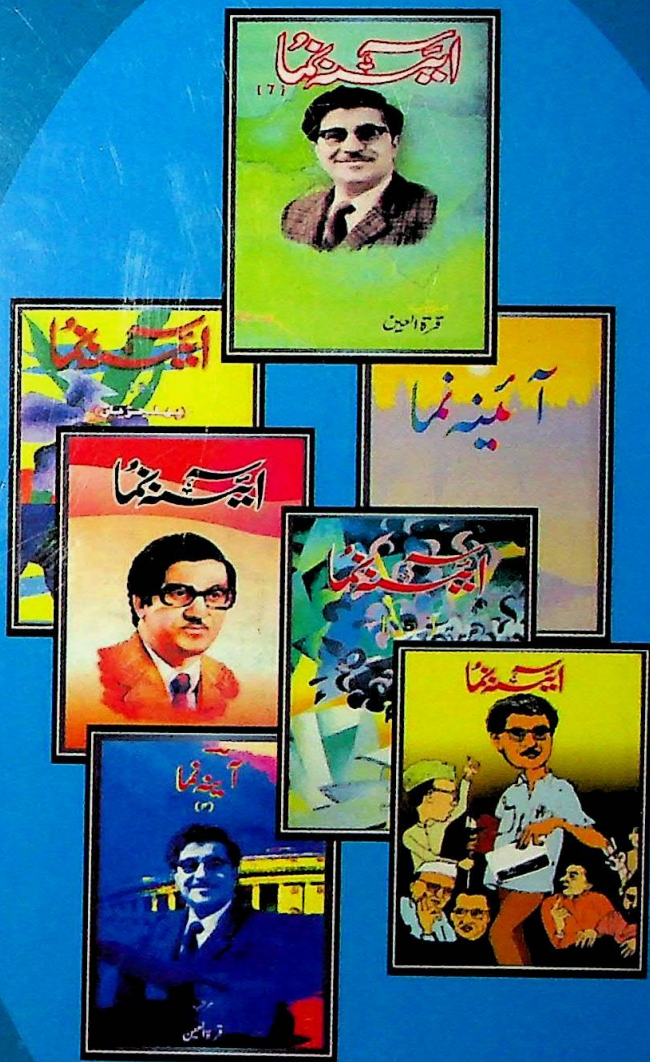
Edited by: *Qurat-ul-Ain*

Designed by
9419707173